مولانا جلال الدین رومیؒ

سیّد ابوالحسن علی ندوی

دعوۃ اکیڈمی
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی با قاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد اپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشر و اشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشر و اشاعت، کتب کی خرید و فروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

مولانا جلال الدّین رُومی رحمۃ اللہ علیہ

مصنف

سیّد ابو الحسن علی ندویؒ

دعوۃ اکیڈمی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

نام کتاب	:	مولانا جلال الدین رومیؒ
مصنف	:	سیّد ابوالحسن علی ندویؒ
نگران طباعت	:	حیران خٹک
سرورق	:	محمد طارق اعظم
کمپوزنگ	:	محمد اعظم
حروف خوانی	:	محمد اشتیاق خاکیؔ
طابع	:	ادارہ تحقیقات اسلامی پریس، اسلام آباد
اشاعت اوّل	:	۲۰۱۱ء
تعداد اشاعت	:	۲۰۰۰
قیمت	:	-/۵۶ روپے

ISBN. 978-969-556-251-2

ناشر

دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

مالک ارض و سما نے جب انسان کو منصب خلافت دے کر زمین پر اتارا تو اسے رہنمائی کے لیے ایک مکمل ضابطۂ حیات سے بھی نوازا۔ شروع سے لے کر آج تک یہ دین' دین اسلام ہی ہے۔ اس کی تعلیمات کو روئے زمین پر پھیلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کو مبعوث فرمایا اور ان سب کو یہی فریضہ سونپا گیا کہ وہ خالق و مخلوق کے درمیان عبودیت کا حقیقی رشتہ استوار کریں' کیونکہ اسی میں انسان کی دنیوی و اخروی نجات کا راز مضمر ہے۔ یہ دین محض چند عبادات اور مذہبی رسومات کی ادائیگی پر مبنی مذہب نہیں جس کا انسان کی عملی زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو اور اس کے تمام تقاضے محض چند مذہبی رسومات کی انجام دہی سے پورے ہو جاتے ہوں' بلکہ یہ ایک ایسا مکمل نظام حیات ہے جو انسان کو زندگی کے ہر مرحلے پر ٹھوس رہنمائی فراہم کرتا ہے اور ہر مشکل اور پریشانی میں اس کی دستگیری کر کے اسے نہایت کامیابی کے ساتھ مصائب و مشکلات اور پریشانیوں کی دلدل سے نکالتا ہے۔ یہ نظام حیات انسان کو صرف اس جہان فانی میں کامیاب زندگی گزارنے کا گر ہی نہیں بتاتا' بلکہ اس پر خلوص دل سے عمل پیرا ہونے کے نتیجے میں دار آخرت میں سرخرو و سرفراز ہونے کی ضمانت بھی دیتا ہے۔

چونکہ دین اسلام اس علیم و خبیر ذات کا عطا کردہ نظام حیات ہے جس نے خود

انسان کو تخلیق کیا ہے، جسے انسانی زندگی کے ایک ایک لمحے کی خبر ہے اور جو ہر دور کی انسانی ضروریات اور تقاضوں سے بخوبی واقف ہے، اس لیے اس کا ودیعت کردہ نظام، دین اسلام بھی انسانی زندگی کا ہر پہلو سے مکمل احاطہ کرتا ہے۔ یہ عقائد و معاملات، عبادات و اخلاق، تہذیب وثقافت، معیشت و معاشرت، قانون وسیاست، تعلیم و تعلم غرض زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔

اسلام کے متعلق قرآن دعوے کے ساتھ کہتا ہے:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰہِ الْاِسْلَامُ

یعنی سچا دین تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے۔

تاریخ کے اوراق اس بات پر شاہد ہیں کہ مختلف ادوار میں جن اقوام نے اس ضابطہ حیات کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی گزاری، اس نظام کے خالق کے ساتھ اپنا رشتہ عبودیت مضبوطی کے ساتھ جوڑا، وہ کامیاب و سرخرو رہے اور دنیا کی امامت ان قوموں کے ہاتھوں میں رہی لیکن جب بھی ان کا تعلق اس دین کے ساتھ کمزور پڑ گیا اور وہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے اس ارفع و اعلیٰ نظام کے بجائے گم کردہ راہ انسانوں کے افکار و نظریات میں اپنی نجات ڈھونڈنے لگے تو ذلیل و خوار ہوئے۔

جب تک دنیا نے تمدنی اور اجتماعی زندگی کے وہ وسائل پیدا نہیں کر لیے جو ساری دنیا کو داعیٔ حق کی دعوت پر جمع کرنے کے لیے ضروری تھے، اس وقت تک اللہ تعالیٰ الگ الگ قوموں کے اندر رسولوں کو بھیجتا رہا لیکن جب انبیاءؑ کی تعلیم و تربیت کے نتیجے میں قوموں کا اخلاقی و اجتماعی شعور اس سطح پر آ گیا کہ وہ ایک عالم گیر نظام عدل کے تحت زندگی بسر کر سکیں اور دنیا کے مادی اور تہذیبی وسائل نے بھی اس حد تک ترقی کر لی کہ ایک ہادی کا پیغام دنیا کے ہر گوشے میں بہ سہولت پہنچ سکے تو اللہ کی رحمت اس بات کی متقاضی ہوئی کہ وہ خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجے اور ان کے ذریعے سے لوگوں کو وہ مکمل نظام

زندگی عنایت فرمائے جو تمام بنی نوع انسان کے مزاج اور ان کے حالات و ضروریات کے عین مطابق ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں اس دین کی تکمیل کرتے ہوئے اعلان فرمادیا:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔

لہٰذا اب رہتی دنیا تک کسی دوسرے ضابطہ حیات اور نظام زندگی کی ضرورت باقی ہے نہ کسی رسول کی رہنمائی درکار ہے۔ سلسلہ نبوت کے تکمیل تک پہنچنے کے بعد دعوت دین کے اس مقدس فریضے کی ذمہ داری اس امت کے سپرد کی گئی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سرپرستی میں تیار ہوئی تھی۔

امت مسلمہ کا مقصد تخلیق ہی دعوت دین اور بشارت حق ہے۔ اس امت کی اصل ذمہ داری یہی ہے کہ مخلوق اور خالق کے درمیان حقیقی رشتے کو استوار کرے اور انسان کو عبودیت کے حقیقی مفہوم سے نہ صرف آگاہ کرے بلکہ اس کو اس بندھن کے تمام تر تقاضے پورا کرنے کی دعوت دے۔ یہ امت اس رسولؐ کی جانشین ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے مکمل کرنے کا اعلان کیا تھا۔ اب اس امت کو اپنی تمام تر صلاحیتیں اور وسائل روئے زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کو اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف بلانے اور اسے اپنانے کی دعوت دینے کے لیے وقف کرنا ہوں گے۔ اس کے لیے یہی راہ نجات ہے۔

دعوت دین سے متعلق اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ یہ وہ بنیادی فریضہ ہے جس کی انجام دہی کے لیے امت مسلمہ کو بھیجا گیا ہے اور اب مسلمانوں کے لیے واحد راہ نجات یہی ہے کہ وہ نہ صرف خود اپنے اجتماعی اور انفرادی معاملات و معمولات اس دین کی تعلیمات کے مطابق انجام دیں بلکہ دوسروں کو بھی اس کی برکات و ثمرات سے آگاہ کر کے اس دین کو قبول کرنے کی دعوت دیں اور اس سلسلے میں اپنی تمام مادی، علمی اور فکری صلاحیتیں بروئے

کارلائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کی صلاحیتوں کا بہترین مصرف ہی یہی ہے۔

جب تک مسلمانوں کو اپنے اس مقصد تخلیق کا شعور حاصل رہا اور وہ دعوت دین میں ہمہ تن مصروف رہے' رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کو زندگی کے ہر شعبے میں مشعل راہ بنائے رکھا' تو دنیا جنت ارضی کا سماں پیش کرنے لگی لیکن جب اسلام کے ساتھ مسلمانوں کا تعلق کمزور پڑ گیا تو اللہ تعالیٰ کی رحمت بھی شامل حال نہیں رہی اور ذلت و مسکنت نہ صرف ان کا مقدر بنی بلکہ دنیا کی دیگر اقوام بھی سکون و راحت کی تلاش میں دربدر بھٹکتی پھر رہی ہیں۔

اس تشویش ناک اور ناگفتہ بہ صورت حال کے باوجود یہ بات باعث اطمینان رہی ہے کہ امت مسلمہ کے ہر دور میں ایسے افراد اور ادارے موجود رہے ہیں جو نامساعد حالات کے باوجود دعوت دین کے فریضے کی ادائیگی میں ہمہ تن مصروف رہے ہیں' مایوسی اور ناامیدی کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں توحید کی شمع جلتی رہی اور کچھ بندگان خدا نہایت خلوص اور دل سوزی کے ساتھ مخلوق کو خالق سے رجوع کرنے کی دعوت دیتے رہے۔ ان سعید روحوں نے انسانوں کو غیر اللہ کی پرستش کی بجائے ایک اللہ کی عبادت کی تعلیم دی اور دین کو اس کی اصل روح کے ساتھ پیش کیا۔ ان بزرگوں اور داعیان حق کی انہی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے کہ ہر دور میں کبھی بھی قلب سلیم رکھنے والے مسلمانوں کے لیے شرک و بدعت کے غبار میں دین حقیقی کو پہچاننا مشکل نہ رہا۔

مولانا جلال الدین رومی کا اسلوب دعوت اپنی نوعیت کے لحاظ سے منفرد تھا۔ انہوں نے ساتویں صدی کے عقلیت زدہ ماحول اور جمود کی فضا میں عشق کی روشنی سے دلوں کو منور کرنے کی راہ اپنائی۔ مولانا جس عشق کی دعوت دیتے ہیں وہ دلِ زندہ کے بغیر ممکن نہیں۔ مولانا کے زمانے میں بھی دل زنگ آلود ہو کر عشق کی قوت سے ناآشنا ہو چکے تھے۔ اور رہنمائی کے لیے دماغ پر انحصار کر رہے تھے۔ مولانا نے لوگوں کو دل کی عظمت اور

وسعت کی طرف متوجہ کیا اور اس کے عجائبات وفتوحات بیان کیے کہ انسان اپنے اس جسم خاکی میں کیسا سدابہار باغ رکھتا ہے اور اس کے پہلو میں کیسی دنیا آباد ہے جس میں ملک کے ملک گم ہو جائیں، جس کو کسی دشمن کا خطرہ اور کسی رہزن کا اندیشہ نہیں۔

سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنی تالیف تاریخ دعوت وعزیمت کی پہلی جلد میں مولانا جلال الدینؒ رومی کے نسخہ عشق اور موازنہ قلب وذہن کو نہایت موثر پیرائے میں پیش کیا جس کا مطالعہ آج بھی مردہ دلوں میں نئی روح پھونکنے کے لیے اکسیر کی حیثیت رکھتا ہے۔

سید ابوالحسن علی ندویؒ کی یہ تحریر دعوۃ اکیڈمی کی جانب سے اس امید پر عوام الناس کے لیے پیش کی جاتی ہے کہ وہ مولانا کے زندگی بخش افکار سے اپنے قلوب کو نئی زندگی سے آشنا کریں اور عشق حقیقی کے ثمرات سے مستفید ہو سکیں۔

امید ہے کہ قارئین دعوۃ اکیڈمی کی اس کاوش کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے اور مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ کی حیات وافکار سے بہت حد تک آگاہ ہو سکیں گے۔

حیران خٹک
ڈپٹی ڈائریکٹر (مطبوعات)
دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

مقدمہ

اصلاح و تجدید کی ضرورت اور تاریخ اسلام میں ان کا تسلسل

زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہے

اسلام اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام ہے، اور کامل و مکمل طور پر دنیا کے سامنے آچکا ہے، اور اعلان کیا جاچکا ہے کہ:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ط (المائدہ۔۳)

آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی، اور دین کی حیثیت سے اسلام کو تمہارے لیے پسند کر چکا۔

ایک طرف تو اللہ کا دین مکمل ہے، دوسری طرف یہ حقیقت ہے کہ زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہے، اور اس کا شباب ہر وقت قائم ہے۔ ؎

جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

اس رواں دواں اور سدا جواں زندگی کا ساتھ دینے اور اس کی رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے آخری طور پر جس دین کو بھیجا ہے، اس کی بنیاد اگرچہ "ابدی عقائد و حقائق" پر ہے، مگر وہ زندگی سے پُر ہے، اور حرکت اس کی رگ و پے میں بھری ہوئی ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ ہر حال میں دنیا کی رہنمائی کر سکے اور ہر منزل میں تغیر پذیر انسانیت کا ساتھ دے سکے، وہ کسی خاص عہد کی تہذیب یا کسی خاص دور کا فن تعمیر نہیں

ہے، جو اس دور کی یادگاروں کے اندر محفوظ ہو، اور اپنی زندگی کھو چکا ہو، بلکہ ایک زندہ دین ہے جو علیم و حکیم صانع کی صنعت کا بہترین نمونہ ہے۔

ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (الانعام:۹۶)

یہ ہے اندازہ غالب اور علم رکھنے والے کا۔

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ (النمل:۸۸)

کاریگری اللہ کی جس نے ہر چیز کو محکم کیا

اُمتِ اسلامیہ کا زمانہ سب سے زیادہ پراز تغیرات ہے

یہ دین چونکہ آخری اور عالمگیر دین ہے، اور یہ امت آخری اور عالمگیر امت ہے، اس لیے یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ دنیا کے مختلف انسانوں اور مختلف زمانوں سے اس امت کا واسطہ رہے گا اور ایسی کشمکش کا اس کو مقابلہ کرنا ہوگا جو کسی دوسری امت کو دنیا کی تاریخ میں پیش نہیں آئی، اس امت کو جو زمانہ دیا گیا ہے، وہ سب سے زیادہ پُر از تغیرات اور پُر از انقلابات ہے اور اس کے حالات میں جتنا تنوع ہے، وہ تاریخ کے کسی گذشتہ دور میں نظر نہیں آتا۔

اسلام کے بقا اور تسلسل کے لیے غیبی انتظامات

ماحول کے اثرات کا مقابلہ کرنے کے لیے اور مکان و زمان کی تبدیلیوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لیے دو انتظامات فرمائے ہیں، ایک تو یہ کہ اس نے جناب رسول اللہ ﷺ کو ایسی کامل و مکمل اور زندہ تعلیمات عطا فرمائی ہیں، جو ہر کشمکش اور ہر تبدیلی کا بآسانی مقابلہ کر سکتی ہیں، اور ان میں ہر زمانہ کے مسائل و مشکلات کو حل کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے، دوسرے اس نے اس کا ذمہ لیا ہے، (اور اس وقت کی تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے) کہ وہ اس دین کو ہر دور میں ایسے زندہ اشخاص عطا فرماتا رہے گا، جو ان تعلیمات کو زندگی میں منتقل کرتے رہیں گے اور مجموعاً یا انفراداً اس دین کو تازہ اور

اس امت کو سرگرم عمل رکھیں گے، اس دین میں ایسے اشخاص کے پیدا کرنے کی جو صلاحیت وطاقت ہے، اس کا اس سے پہلے کسی دین سے اظہار نہیں ہوا، اور یہ امت تاریخ عالم میں جیسی "مردم خیز" ثابت ہوئی ہے، دنیا کی قوموں اور امتوں میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، یہ محض اتفاقی بات نہیں ہے، بلکہ انتظام خداوندی ہے کہ جس دور میں جس صلاحیت وقوت کے آدمی کی ضرورت تھی، اور زہر کو جس "تریاق" کی حاجت تھی، وہ اس امت کو عطا ہوا۔

اسلام کے قلب وجگر پر حملے

شروع ہی سے اسلام کے قلب وجگر اور اس کے اعصاب پر ایسے حملے ہوئے ہیں کہ دوسرا مذہب ان کی تاب نہیں لا سکتا، دنیا کے دوسرے مذاہب جنھوں نے اپنے اپنے وقت میں دنیا فتح کرلی تھی، اس سے کم درجہ کے حملوں کو سہار نہ سکے اور انھوں نے اپنی ہستی کو گم کر دیا، لیکن اسلام نے اپنے ان سب حریفوں کو شکست دی اور اپنی اصلی شکل میں قائم رہا۔ ایک طرف باطنیت اور اس کی شاخیں، اسلامی روح اور اس کے نظام عقائد کے لیے سخت خطرہ تھیں، دوسری طرف مسلمانوں کو زندگی سے بے دخل کرنے کے لیے صلیبیوں کی یورش اور تاتاریوں کا حملہ بالکل کافی تھا۔ دنیا کا کوئی دوسرا مذہب ہوتا تو وہ اس موقع پر اپنے سارے امتیازات کھو دیتا اور ایک تاریخی داستان بن کر رہ جاتا، لیکن اسلام ان سب داخلی وخارجی حملوں کو برداشت کر لے گیا، اور اس نے نہ صرف اپنی ہستی قائم رکھی، بلکہ زندگی کے میدان میں نئی نئی فتوحات حاصل کیں، تحریفات، تاویلات، بدعات، عجمی اثرات، مشرکانہ اعمال ورسوم، مادیت، نفس پرستی، تعیشات، الحاد ولادینیت، اور عقلیت پرستی، کا اسلام پر بارہا حملہ ہوا، اور کبھی کبھی محسوس ہونے لگا کہ شاید اسلام ان حملوں کی تاب نہ لاسکے، اور ان کے سامنے سپر ڈال دے، لیکن امتِ مسلمہ کے ضمیر نے تحریفات و

تاویلات کا پردہ چاک کر دیا، اور حقیقت اسلام اور "دین خالص" کو اجاگر کیا، بدعات اور عجمی اثرات کے خلاف آواز بلند کی، سنت کی پُرزور حمایت کی، عقائدِ باطلہ کی بے باکانہ تردید اور مشرکانہ اعمال و رسوم کے خلاف علانیہ جہاد کیا، مادیت اور نفس پرستی پر کاری ضرب لگائی، تعیشات اور اپنے زمانے کے "مترفین"[1] کی سخت مذمت کی، اور جابر سلاطین کے سامنے کلمۂ حق بلند کیا، عقلیت پرستی کا طلسم توڑا، اور اسلام میں نئی قوت و حرکت و مسلمانوں میں نیا ایمان اور نئی زندگی پیدا کر دی، یہ افراد دماغی، علمی، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اپنے زمانہ کے ممتاز ترین افراد تھے، اور طاقت ور اور دلآویز شخصیتوں کے مالک تھے، جاہلیت اور ضلالت کی ہر نئی ظلمت کے لیے ان کے پاس کوئی نہ کوئی "ید بیضا" تھا جس سے انھوں نے تاریکی کا پردہ چاک کر دیا، اور حق روشن ہو گیا، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس دین کی حفاظت اور بقا منظور ہے، اور دنیا کی رہنمائی کا کام اسی دین اور اسی امت سے لینا ہے، اور جو کام وہ پہلے تازہ نبوت اور انبیاء سے لیتا تھا، اب رسول اللہ ﷺ کے نائبین اور امت کے مجددین و مصلحین سے لے گا۔

دوسرے مذاہب کی تاریخ میں تجدیدی شخصیتوں کی کمی

اس کے برخلاف دنیا کے دوسرے مذاہب میں ایسی ہستیوں کی نمایاں کمی نظر آتی ہے، جو ان مذاہب میں نئی روح اور ان کے ماننے والوں میں نئی زندگی پیدا کر دیں، ان کی تاریخ میں صدیوں اور ہزاروں برس کے ایسے خلا نظر آتے ہیں جن میں اس دین کا کوئی مجدد دکھائی نہیں دیتا، جو اس دین کو تحریفات و بدعات کے نرغہ سے نکالے، اس کی حقیقت واضح

---

[1] متکبر دولتمندوں اور مستغنی آسودہ حال اور فارغ البال لوگوں کو قرآن مجید "مترفین" کے لفظ یاد کرتا ہے۔

کرے، اصل دین اور حقیقتِ ایمان کی طرف پوری قوت سے دعوت دے، رسوم کے خلاف پُرزور صدائے احتجاج بلند کرے، مادیت و نفس پرستی کی تحریک و رجحانات کے خلاف جہاد کرنے کے لیے کمربستہ ہو کر میدان میں آجائے، اور اپنے یقین، سچی روحانیت اور قربانی سے اس مذہب کے پیروؤں میں نئی روح اور نئی زندگی پیدا کر دے۔

اس کی سب سے بڑی مثال مسیحیت ہے، وہ اپنے عہد کے آغاز یعنی پہلی صدی مسیحی کے نصف ہی میں ایسی تحریفات کا شکار ہوئی جس کی نظیر اس دور کی تاریخ مذاہب میں کہیں نہیں ملتی، وہ ایک صاف اور سادہ توحیدی مذہب سے ایک ایسے مشرکانہ مذہب میں تبدیل ہو گئی، جس کو یونانی اور بودھ افکار و خیالات کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے، دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ اس کے سب سے بڑے داعی اور پیرو سینٹ پال (۱۰۔۶۵ء) کے ہاتھوں ہوا، یہ تبدیلی دراصل ایک روح سے دوسری روح، ایک شکل سے دوسری شکل اور ایک نظام سے دوسرے نظام کی طرف ایسی جست یا چھلانگ کے مرادف تھی جس میں پہلی شکل سے صرف نام اور بعض رسوم کا اشتراک باقی رہ گیا تھا، ایک مسیحی فاضل (Eruset de Bunsen) اس تغیر و انقلابات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> "جس عقیدہ اور نظام کا ذکر ہمیں انجیل میں ملتا ہے، اس کی دعوت حضرت مسیحؑ نے اپنے قول و عمل سے کبھی نہیں دی تھی، اس وقت عیسائیوں اور یہودیوں و مسلمانوں کے درمیان جو نزاع قائم ہے، اس کی ذمہ داری حضرت مسیحؑ کے سر نہیں ہے بلکہ یہ سب اس یہودی، عیسائی بے دین پال کا کرشمہ ہے، نیز صحف مقدسہ کی تمثیل و تجسیم کے طریقہ پر تشریح اور ان صحیفوں کو پیش گوئیوں اور مثالوں سے بھر دینے کا نتیجہ ہے، پال نے اسٹیفن (Stephen) کی تقلید میں جو مذاہب ایسانی (Essenio) کا داعی ہے، حضرت مسیحؑ کے ساتھ بہت

سی بودھ رسوم وابستہ کر دیں، آج انجیل میں جو متضاد کہانیاں اور واقعات ملتے ہیں، اور جو حضرت مسیحؑ کو ان کے مرتبہ سے بہت فروتر شکل میں پیش کرتے ہیں وہ سب پال کے وضع کیے ہوئے ہیں، حضرت مسیحؑ نے نہیں، بلکہ پال اور ان کے بعد آنے والے پادریوں اور راہبوں نے اس سارے عقیدہ و نظام کو مرتب کیا ہے، جس کو آرتھوڈکس مسیحی دنیا نے اٹھارہ صدیوں سے اپنے عقیدہ کی اساس قرار دے رکھا ہے"[۲]۔

مسیحیت نے طویل صدیوں تک اور آج بھی پال کی اس روح اور اس کے ورثہ کو سینہ سے لگائے رکھا، اور اس پوری مدت میں مسیحی دنیا میں کوئی ایسا آدمی پیدا نہیں ہوا، جو مسیحیت کے اس بیرونی مستعار اور غیر حقیقی نظام کے خلاف علَمِ بغاوت بلند کرے، اور اس نقطہ کی طرف واپسی کی کوشش کرے، جس نقطہ پر حضرت مسیحؑ اور ان کے مخلص خلفا اور متبعین چھوڑ کر گئے تھے، صدیوں پر صدیاں بیت گئیں، اور کوئی ایسا شخص پیدا نہ ہوا، جو مسیحیت کے ان نئے اور بیرونی اجزا کو علیحدہ کر سکے، آخر کار پندرہویں صدی مسیحی میں مارٹن لوتھر (M. Luther) جرمنی میں پیدا ہوا، اور اس نے بعض جزئی مسائل میں کچھ محدود قسم کی اصلاح کی، یہ کوئی جوہری یا عمومی اصلاح نہ تھی، اور نہ مسیحیت کے غلط رخ اور اس کے انحراف کے خلاف کوئی بغاوت، گویا مسیحیت کی تاریخ کی تقریباً پندرہ صدیاں انقلاب انگیز بنیادی اور کامیاب اصلاح مذہب کی تحریکوں سے خالی رہیں، اور اس عرصہ میں کوئی کوشش بھی پورے طور پر بار آور اور نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی، مسیحی فضلا کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ اس طویل مدت میں مسیحی دنیا میں کوئی شخصیت یا تحریک رونما نہیں ہوئی، جو مسیحیت کی

---

[۲] Islam or true Christainity-P.120

اصلاح یا تجدید میں نمایاں کامیابی حاصل کر سکے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مقالہ نگار (J. Bassmullinger) لکھتا ہے:

"اگر ہم اس کے اسباب تلاش کریں کہ سولہویں صدی سے قبل اصلاح مذہب (ریفارمیشن) کی کوششوں میں جزوی کامیابی بھی کیوں نہ ہوئی تو بلا کسی دشواری کے کہہ سکتے ہیں کہ سب سے بڑا سبب قرونِ وسطیٰ کے ذہن کی ماضی کی مثالوں کی غلامی تھی"۔[۳]

دوسری جگہ لکھتا ہے:

"چرچ کے اصلاح کی کوئی جامع تجویز بروئے کار لانے کی ان کی مسلسل کوششوں کی ناکامی یورپین تاریخ کی ایک جانی بوجھی حقیقت ہے"۔[۴]

یہی مقالہ نگار آگے لکھتا ہے:

"سولہویں صدی سے قبل اصلاح مذہب کی چند نہیں متعدد اور بعض بہت یادگار قسم کی کوششیں کی جا چکی تھیں، لیکن بلا استثناان سب کو کلیسا کی لعنت و ملامت کا شکار ہو جانا پڑا تھا"۔[۵]

اس کے بعد کوئی دوسرا شخص ایسا پیدا نہیں ہوا، جو کلیسا کے خرافات و اوہام اور اس کی زبردستیوں کے خلاف اپنی آواز بلند کرتا اور کم از کم اتنا ہی کرتا جتنا لوتھر نے (اپنے مخصوص دائرہ عمل اور کمزوری کے باوجود) کیا تھا۔

---

۳ Enc. Brittanica-Ed- IX Vol. XX p.320 Article by J.B Mullinger

۴ ایضاً ص ۳۲۱

۵ ایضاً ص ۳۲۱

غرض اس طرح مسیحیت اس راستہ پر مسلسل چلتی رہی، جس کو اس نے اپنے لیے انتخاب کیا تھا، یا زیادہ صحیح الفاظ میں اس کے سر تھوپ دیا گیا تھا، کلیسا کا اثر کم پڑ گیا، اور بعد میں اس کا اقتدار بالکل ختم ہو گیا۔ یورپ میں مادیت کی حکومت قائم ہوئی، اور اس نے اس اصل مذہب کی جگہ لے لی، اور مغرب کے ہر مذہب کو اس نے اپنے پیچھے چھوڑ دیا، اور مسیحیت میں کوئی ایسا انسان پیدا نہ ہو سکا جو اس مادیت کا مقابلہ کرتا اور اس کو اپنے صحیح مرکز پر واپس لاتا، یا عیسائیوں میں اپنے مذہب پر اعتماد کو بحال کرتا، ان سب میں وہ روحانی و اخلاقی قوت پیدا کرتا جو ان کو مادیت کے ان زبردست تھپیڑوں اور ایمان سوز ترغیبات کے سامنے ثابت قدم رکھ سکے، اور ان کو ایسی زندگی گزارنے پر مجبور کر سکے، جو علم و اخلاق اور صحیح عیسائی عقائد پر قائم ہو، اور جہاں نئے زمانے کے سوالات، عصر جدید کے مسائل کا حل اسی کی روشنی میں ممکن ہو، اس کے برعکس یہ ہوا کہ عیسائی مفکرین، مصنفین مسیحیت کے مستقبل سے خود مایوس ہو گئے اور لادینی مادیت کے مقابلہ میں ان کے اندر احساس کمتری پیدا ہو گیا۔

یہی قصہ مشرق کے مذاہب کے ساتھ بھی پیش آیا، ہندو مذہب بھی اپنی اصل راہ سے بالکل ہٹ گیا، اس نے اپنی سادگی اور خالقِ کائنات سے براہِ راست روحانی نسبت بالکل کھو دی، اخلاقی قوت بھی مفقود ہو گئی، اور اپنی پیچیدگی کی وجہ سے وہ محض ایک دقیق اور غیر عملی فلسفہ بن کر رہ گیا، اور رفتہ رفتہ عقائد میں توحید خالص اور معاملات میں مساوات دونوں اہم چیزوں کا سر رشتہ اس کے ہاتھ سے بالکل چھوٹ گیا، اور یہی وہ دو اہم بنیادیں تھیں، جن پر کوئی ایسا مذہب قائم ہو سکتا ہے، جس کی جڑیں باطن میں مضبوط ہوں، اور شاخیں ظاہر میں پھیلی ہوئی ہوں۔

اپنیشد کے مصنفین نے بہت کوشش کی کہ اس فساد کا تدارک کریں، چنانچہ انھوں نے ان رسوم کو جو ہندو مذہب اور ہندو سماج پر پوری طرح چھا گئی تھیں، مسترد کر دیا اور اس کی جگہ ایک ایسے فلسفیانہ اور تصوراتی نظام کو پیش کیا جو کثرت میں وحدت کے نظریہ

پر قائم تھا، یہ نئی تصویر ہندو مذہب کے علمی حلقوں میں تو ضرور پسند کی گئی، اس لیے کہ ان کا رجحان شروع ہی سے وحدۃ الوجود ہمہ اوست کی طرف تھا، لیکن عوام نے جن کی فکری سطح پست تھی، اور جو عملی نظام اور عملی تعلیمات کے خواہشمند تھے، اس بات کو قبول نہ کیا، اور اس طرح ہندو مذہب رفتہ رفتہ اپنی قوت و تاثیر کھوتا رہا، اس کی طرف سے بے اعتمادی اور بے اطمینانی روز بروز بڑھنے لگی، ہندو سماج کی یہی بے اطمینانی اور بے چینی تھی، جس نے آگے چل کر بودھ کی شخصیت میں جنم لیا، یہ مرحلہ چھٹی صدی قبل مسیح میں سامنے آیا۔

بودھ نے ایک نیا فکر یا ایک نیا مذہب (اگر اس موقع پر لفظ مذہب کا استعمال درست ہو) پیش کیا جو ترک دنیا، تہذیب نفس، خواہش سے مقابلہ، رحم دلی و ہمدردی، خدمت و عمل اور رسوم و عادات اور طبقاتی کشمکش کی تردید و مخالفت پر قائم تھا، جو ہندو سماج میں آخر زمانہ میں بہت نمایاں ہو گئی تھی، یہ فکر یا یہ مذہب[1] بہت سرعت کے ساتھ پھیلا، اور ایشیا کے جنوبی اور مشرقی حصہ پر جو بحر ہند اور بحر الکاہل کے درمیان واقع ہے، اس کا تسلط قائم ہو گیا۔

لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد یہ زبردست مذہبی تحریک بھی اپنے راستے سے ہٹ گئی، اور تحریف کا شکار ہو گئی، مورتیاں اور رسوم وغیرہ جن کے خلاف اس مذہب نے عَلَم بغاوت بلند کیا تھا، اس پر پھر سے حملہ آور ہوئے، یہاں تک کہ اس کے آخر دور میں وہ بھی شرک اور مورتی پوجا کا مذہب بن کر رہ گیا، جو اپنے پیشرو ہندو مذہب سے مورتیوں کی اقسام اور ان کی تعداد کے سوا کسی اور چیز میں مختلف اور بہتر نہ تھا، اس کی اخلاقیات کو بھی زوال

---

[1] بودھ مت کے لیے لفظ مذہب کے استعمال میں مجھے تردد اس لیے ہے کہ اس میں خالق اور مبدا و معاد کے سلسلہ میں کوئی عقیدہ یا نظریہ نہیں ملتا اور اکثر مصنفین و مورخین کی یہی رائے ہے، دیکھیے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا لفظ بودھ (Buddha)

ہوا، افکار و خیالات میں پیچیدگی اور بڑھ گئی، نئے نئے فرقے اور مذہبی گروہ قائم ہو گئے، پروفیسر ایشور اٹوپا اپنی کتاب "ہندوستانی تمدن" میں لکھتے ہیں:

"بودھ مت کے سایہ میں ایسی حکومت قائم ہوئی جس میں اوتاروں کی بھرمار اور مورت پرستی کا دور دورہ دکھلائی دینے لگا، سنگھوں کی فضا بدل رہی تھی، اس میں بدعتیں اور جدتیں یکے بعد دیگرے نظر آ رہی تھیں"۔

پنڈت جواہر لال نہرو اپنی کتاب "تلاش ہند" (Discovery of India) میں بدھ مت کے بگاڑ اور تاریخی زوال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

برہمنیت نے بودھ کو اوتار بنایا، اور بودھ مت نے بھی یہی کیا، سنگھ بہت دولتمند ہو گئے اور ایک خاص جماعت کے مفاد کے مرکز بن کر رہ گئے، اوران میں ضبط و قاعدہ بالکل نہیں رہا۔ عبادت کے طریقوں میں سحر اور اوہام داخل ہو گئے، اور ہندوستان میں ایک ہزار سال تک باقاعدہ رائج رہنے کے بعد بودھ مت کا تنزل شروع ہو گیا، اس عہد میں اس کی جو مریضانہ کیفیت تھی، (Mrs. Rhys Dayis) نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

"ان مریضانہ خیالات کے گہرے سایہ میں آکر گوتم کی اخلاقی تعلیم نظر سے او جھل ہو گئی، ایک نظریہ پیدا ہوا اور اس نے فروغ پایا، اس کی جگہ دوسرے نے لے لی اور ہر ایک قدم پر ایک نیا نظریہ پیدا ہونے لگا، یہاں تک کہ ساری فضا میں ذہن کی ان پر فریب تخلیقوں

ہندوستانی تمدن (اردو) ایشور اٹوپا

سے گھٹاٹوپ اندھیرا چھا گیا، اور بانیٔ مذہب کے سادہ اور بلند اخلاقی درس ان الٰہیاتی موشگافیوں کے انبار کے نیچے دب کر رہ گئے"[8]۔

مجموعی حیثیت سے بودھ مت اور برہمنیت دونوں میں گراوٹ پیدا ہو گئی، اور ان میں اکثر مبتذل رسوم داخل ہو گئیں، دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا، اس وسیع بودھ دنیا میں اور اس کی حکمرانی کی اس طویل مدت میں کوئی ایسا مصلح سامنے نہ آیا، جو حقیقی بودھ مت کی طرف دعوت دے اور اس جدید اور منحرف مذہب کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرے، اور اس کا گذشتہ دور شباب اور اس کی گم شدہ سادگی اور صفائی پھر سے واپس لے آئے[9]۔

غرض قدیم ہندو مذہب، بودھ مت کے سامنے بالکل پنپ نہ سکا یہاں تک کہ آٹھویں صدی مسیحی میں شنکر آچاریہ[10] نے بدھ مت کی مخالفت اور قدیم ہندو مذہب کی اشاعت کا علم بلند کیا اور آخر کار اس کو اس ملک سے تقریباً باہر ہی کر دیا یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی حیثیت ہندوستان کے بہت سے مذاہب میں ایک قدیم رو بہ زوال اور محدود مذہب کی رہ گئی۔ شنکر آچاریہ نے اپنی ذہانت، مذہبی جرات اور جوشِ عمل سے یہ تو کیا کہ بودھ مت کو بالکل زندگی سے بے دخل کر دیا لیکن وہ اس باب میں کامیاب نہ ہوئے۔ (بلکہ شاید اس کا انہوں نے سرے سے ارادہ ہی نہیں کیا تھا) کہ قدیم ہندو مذہب کو اس کی پہلی اور حقیقی شکل پر واپس لے آئیں، اس میں توحید کا عقیدہ خالقِ کائنات سے براہِ راست اتصال، بندہ اور خدا

---

[8] تلاش ہند ص: ۲۰۱۔۲۰۳

[9] ایضاً ص: ۲۰۱۔۲۰۳

[10] شنکر آچاریہ آٹھویں صدی کے نصف آخر میں گزرا ہے، ۳۲ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

کے درمیان واسطوں کی نفی، اجتماعی انصاف اور طبقاتی مساوات کی روح پیدا کریں چنانچہ آج تک یہ دونوں ہندوستانی مذاہب اپنی بدلی ہوئی ہیئت پر قائم ہیں اور دورِ انحطاط کی میراث رسوم و عادات اور مورتیوں کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ مذاہب و اخلاق کے انسائیکلوپیڈیا(Encyclopedia of Religion and Ethics)کے مقالہ نگار (V.S Ghate) جو الفنٹن کالج بمبئی میں سنسکرت کے پروفیسر تھے اور ہندوستان کے قدیم مذاہب و فلسفوں پر گہری نظر رکھتے ہیں، شنکر آچاریہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد اس نظام مذہب اور فلسفہ کا زندہ کرنا تھا جس کی "اوپنشید" میں تعلیم دی گئی ہے اس نے مطلق وحدۃ الوجود کے عقیدہ کو رائج کر دیا اس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ وہ یہ بتائے کہ "اوپنشید" اور بھگوت گیتا میں قانون پیش نہیں کیا گیا ہے بلکہ مکمل وحدۃُ الوجود کی تعلیم ہے، شنکر آچاریہ نے بت پرستی کی نہ مخالفت کی اور نہ حملہ کیا، اس کے نزدیک بت ایک رمز اور مظہر ہیں شنکر آچاریہ نے رسمیت (Ritualsm) اور کرما کی مذمت کی، لیکن مقبول عام دیوتاؤں کی پرستش کی طرف سے مدافعت کی، اپنے نشو و نما کی ایک خاص منزل میں بت پرستی ہماری فطرت کی ایک ضرورت ہے۔ جب مذہبی روح پختہ اور بالغ ہو جاتی ہے تو پھر بُت پرستی کی ضرورت نہیں رہتی ہے، علامتوں اور رموز کو ترک کر دینا چاہیے۔ جب مذہبی روح پختہ اور بالغ ہو جاتی ہے"۔ شنکر نے بتوں کی اجازت دی، بحیثیت ایک علامت کے ان لوگوں کے لیے جو ایسے برہمنوں کے مرتبے تک نہیں پہونچ سکے، جو صفات سے آزاد اور نا قابل تبدیل ہوں""[1]۔

بہر حال وہ تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں جو شنکر آچاریہ سے لے کر دیانند سرسوتی

---

[1] ماخوذ از مقالہ شنکر آچاریہ باختصار و انتخاب ملاحظہ ہو:

Enc. of Religion and Ethics- Fourth Editon 1958 Article Sankarachrya

اور گاندھی جی تک کی گئیں اور جن کا مقصد اس مذہب کا اس کی ان صحیح بنیادوں پر احیا تھا جو نبوت کی دعوت انسان کی فطرت سلیم اور تغیر پذیر عہد سب کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ ان دونوں مذاہب نے آخر کار مادیت لادینیت کے سامنے بالکل سپر ڈال دی ہے، اور زندگی سے کنارہ کش ہو کر عبادت گاہوں اور تیرتھ گاہوں میں پناہ لی ہے، اور رسوم وعادات اور ظاہر اشکال میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں، ہندوستان میں اس وقت کوئی ایسی طاقتور دعوت نہیں جس کا نعرہ اور جس کا منشور یہ ہو (پھر سے مذہب کی طرف آؤ) اس کے برعکس ایسی تحریکیں بہت بیدار اور طاقتور ہیں، جن کا نعرہ اور اصول یہ ہے کہ اپنی پرانی تہذیب کو زندہ کرو، اور ہندوستان کی قدیم تاریخی زبان "سنسکرت" کو پھر سے ملک میں رائج کرو۔

مذہب کو زندہ اشخاص کی ضرورت

دراصل کوئی مذہب اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتا، ان خصوصیات کو زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رکھ سکتا، اور بدلتی ہوئی زندگی پر اثر نہیں ڈال سکتا جب تک وقتاً فوقتاً اس میں ایسے اشخاص نہ پیدا ہوتے رہیں، جو اپنے غیر معمولی یقین، روحانیت، بے غرضی و ایثار اور اپنی اعلیٰ دماغی اور قلبی صلاحیتوں سے اس کے تن مردہ میں زندگی کی نئی روح پھونک دیں، اور اس کے ماننے والوں میں نیا اعتماد اور جوش اور قوتِ عمل پیدا کر دیں، زندگی کے تقاضے ہر وقت جواں ہیں، مادّیت کا درخت سدا بہار ہے، نفس پرستی کی تحریک اور اس کے مذہب کو حقیقتہً کسی تجدید کی ضرورت نہیں کہ اس کی ترغیبات اور اس کے محرکات قدم قدم پر موجود ہیں، پھر بھی اس کی تاریخ اس کے پُرجوش داعیوں اور کامیاب مجددوں سے کبھی خالی نہیں رہی، جنہوں نے اس کی جوانی کو قائم اور اس کی دعوت کو اس وقت تک زندہ رکھا ہے۔ ؏

اگرچہ پیر ہے مومن جواں ہیں لات ومنات

اس کا مقابل جب ایک نئی زندگی اور نئی طاقت کے ساتھ میدان میں نہیں آئے گا، اور وقتاً فوقتاً اس کی تجدید نہیں ہوتی رہے گی، تازہ دم مادّیت کے مقابلہ میں اس کا زندہ رہنا مشکل ہے۔

ہر نئے فتنہ اور نئے خطرے کے لیے نئی شخصیت و طاقت

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اسلام کی اس طویل اور پر آشوب تاریخ میں کوئی قلیل سے قلیل مدت ایسی نہیں پائی جاتی، جب اسلام کی حقیقی دعوت بالکل بند ہو گئی، حقیقتِ اسلام بالکل پردہ میں چھپ گئی ہو امت اسلامیہ کا ضمیر بالکل بے حس ہو گیا ہو اور تمام عالم اسلام پر اندھیرا چھا گیا ہو، یہ تاریخی واقعہ ہے کہ جب کبھی اسلام کے لیے کوئی فتنہ نمودار ہوا، اس کی تحریف اور اس کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی یا اس کو غلط طریقہ پر پیش کیا گیا، مادیت کا کوئی سخت حملہ ہوا، کوئی طاقتور شخصیت ایسی ضرور میدان میں آگئی جس نے اس فتنہ کا پوری طاقت سے مقابلہ کیا اور اس کو میدان سے ہٹا دیا بہت سی دعوتیں اور تحریکیں ایسی ہیں جو اپنے وقت میں بڑی طاقتور تھیں، لیکن آج ان کا وجود صرف کتابوں میں رہ گیا ہے، ان کی حقیقت کا سمجھنا بھی آج مشکل ہے، کتنے آدمی ہیں، جو قدریت، جہمیت، اعتزال، خلقِ قرآن، وحدۃ الوجود اور اکبر کے دین الٰہی کی حقیقت اور تفصیلات سے واقف ہیں، حالانکہ یہ اپنے اپنے وقت کے بڑے اہم عقائد و مذاہب تھے، ان میں سے بعض کی پشت پر بڑی بڑی سلطنتیں تھیں، اور اپنے زمانہ کے بعض بڑے ذہین اور لائق اشخاص ان کے داعی اور علمبردار تھے، لیکن بالآخر حقیقتِ اسلام نے ان پر فتح پائی اور کچھ عرصہ کے بعد یہ زندہ تحریکیں اور سرکاری مذہب علمی مباحث بن کر رہ گئے، جو صرف علم کلام اور تاریخ عقائد کی کتابوں میں محفوظ ہیں، دین کی حفاظت کی یہ جدوجہد، تجدید و انقلاب کی کوشش اور دعوت و اصلاح کا یہ سلسلہ اتنا ہی پرانا ہے، جتنی اسلام کی تاریخ، اور ایسا ہی مسلسل ہے، جیسی

مسلمانوں کی زندگی۔

تاریخ کے گم شدہ مآخذ

لیکن اس کی ذمہ داری صرف مورخین پر عائد نہیں ہوتی۔ اس کے ذمہ دار تمام لوگ ہیں، جو تاریخ کی اصطلاحی اور سرکاری حیثیت کے سوا کوئی اور حیثیت ماننے پر تیار نہیں، اور کسی ایسی کتاب کو لائقِ اعتبار نہیں سمجھتے جو کسی کتب خانہ میں تاریخ کی الماری کے اندر نہ ہو۔ یا فن تاریخ کے تحت درج نہ ہو، حالانکہ ایسی بہت سی کتابیں اپنے اندر تاریخ کا بہت قیمتی ذخیرہ رکھتی ہیں، اور ان کو بہت اہم ماخذ قرار دیا جا سکتا ہے، یہ وہ ادبی اور دینی کتابیں ہیں، جن میں ان داعیوں اور مصلحین امت نے اپنے دلی احساسات و کیفیات کو بے نقاب کیا ہے، اور اپنی زندگی کے اہم واقعات اور تجربے درج کیے ہیں، یہ وہ کتابیں ہیں جن میں شاگردوں اور مریدوں نے اپنے اساتذہ و شیوخ کے نصائح و ملفوظات اور حقائق و معارف قلم بند کیے ہیں، اور ان کی پر اثر بابرکت مجلسوں کی روئداد پیش کی ہے، یہ مکتوبات اور مواعظ کے وہ مجموعے ہیں جن سے ان کے خیالات و افکار، اور جذبات و کیفیات کا صحیح اندازہ ہوتا ہے، یا وہ کتابیں جو احتسابِ سوسائٹی پر تنقید اور بدعات و منکرات کے رد و ابطال میں لکھی گئی ہیں، اگر ہمارا مطالعہ اپنی مقرر کردہ حدود سے آگے بڑھ کر ان اہم اور گم شدہ تاریخی مآخذ تک وسیع ہو سکتا اور کوئی وسیع النظر نکتہ رس اور باہمت محقق اس موضوع پر جم کر کام کر سکتا تو ایک مربوط و مکمل تاریخ اصلاح و تجدید پیش کرنے میں کامیاب ہو جاتا، اور ہمیں صاف نظر آتا کہ دعوت و عزیمت دونوں چیزیں اس اُمت کے ہر دور اور ہر مرحلہ میں اس کا ساتھ دیتی رہیں، اور انہوں نے کبھی اس کو مایوس اور محروم نہیں کیا۔

اسلام کی میراث

یہ میراث جو ہمارے ہاتھ میں پہنچی (اور جس کو ہم میراث) کے معنی میں نہیں

بول رہے ہیں، جو اہلِ مغرب کا مفہوم ہے، اس لیے کہ اسلام ایک زندہ جاوید دین ہے، ہم میراث سے وہ دولت اور ثروت مراد لیتے ہیں، جو ہمارے اسلاف سے ہماری طرف منتقل ہوئی ہے، علم راسخ، محفوظ و مضبوط عقائد، طاقتور ایمان، سنت سنیّہ، اخلاقِ عالیہ، فقہ و شریعت اور شاندار اسلامی ادب کی ثروت اس میراث میں ہر اس فرد کا پورا حصہ ہے، جس نے اسلام کے کسی دور میں بھی منہاج خلافت پر حکومت قائم کی، جاہلیت اور مادیت کا مقابلہ کیا، اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی، اسلام کے خصائص مٹ گئے تھے، ان کو اُجاگر کیا، امت میں ایمانی روح پیدا کی، اس لازوال ثروت میں ہر اس شخص کا اضافہ تسلیم کیا جائے گا، جس نے اس دین پر اس کے ماخذ اور اس کی تعبیرات پر اعتماد کو از سر نو استوار کیا، نووارد فلسفوں کا ابطال کیا، اسلام کی حقیقی فکر کی حفاظت کی، اور اس امت کو کسی نئے فتنہ میں پڑنے سے باز رکھا، جس نے اس امت کے لیے اس کے دین اور مصادر دین کی حفاظت کی، حدیث و فقہ کی تدوین جدید کا کام انجام دیا، اجتہاد کا دروازہ کھولا اور امت کو تشریع کا خزانۂ عامرہ اور زندگی و معاشرہ کا منظم قانون عطا کیا، جس نے معاشرہ میں احتساب کا فرض ادا کیا، اور اس کے انحراف اور کج روی پر کھل کر تنقید کی، اور صحیح و حقیقی اسلام کی برملا و آشکارا دعوت دی، جس نے شکوک و شبہات کے دور اور اضطراب عقائد کے زمانہ میں علمی طرز استدلال اختیار کر کے دماغوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی، اور ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی، جس نے دعوت و تذکیر اور انذار و تبشیر میں انبیا علیہم السلام کی نیابت کی اور ایمان کی دبی ہوئی چنگاریوں کو شعلۂ جوالہ کی حرارت و حرکت بخشی، جس نے مادہ پرستی کے تُند و تیز دھارے کے سامنے کھڑے ہو کر اس کی تیزی و بلاخیزی کم کی اور خدا کی مخلوق کو اس دھارے میں بہہ جانے یا اس میں دب جانے سے محفوظ رکھا، جس نے اس امت کی سیاسی قوت کی حفاظت کی اور اس کو پے در پے خارجی حملوں کو سہار لینے کی قوت عطا کی، جس نے اپنی حکیمانہ دعوت اور اپنے دامِ محبت سے اس دشمن کو شکار کیا، جو زورِ شمشیر اور نوکِ خنجر سے بھی زیر نہ ہو سکا تھا، اور جس

نے عالم اسلام کو اس سرے سے اس سرے تک زیر وزبر کر کے رکھ دیا تھا، جس نے اپنے طاقت ور ایمان اور اپنی روحانی قوت سے ایسے دشمنوں کو حظیرۂ اسلام میں داخل کیا اور محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی غلامی کا شرف بخشا، جس نے اپنے طاقتور ادب اور دل گداز و بلیغ اشعار سے ان ذہنوں کو اسیر وام کیا جو علمی مباحث اور مذہبی فلسفوں سے مطمئن ہونے والے نہیں تھے، یہ پورا ایک سلسلہ ہے اور اس میں ہر شخصیت کا ایک خاص حصہ اور مرتبہ ہے، تاریخ دراصل امانت کی ادائیگی اور حق شناسی اور اعترافِ حقیقت کا نام ہے ان میں ہر شخص اسلام کی کسی نہ کسی سرحد کا محافظ اور اسلام کے ترکش کا ایک قیمتی تیر تھا، اگر ان لوگوں کی مخلصانہ کوششیں نہ ہوتیں، جن کو آج ہم تاریخ کی دوربین سے دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں، تو ہم تک یہ مجموعہ نہ پہونچ پاتا جس میں ہمارے لیے عزت، عبرت اور موعظت کا وافر سامان موجود ہے۔ اور جس کی موجودگی میں ہم اقوام عالم کے سامنے بجا طور پر اپنا سر بلند رکھ سکتے ہیں۔

آئندہ صفحات میں مولانا جلال الدین رومیؒ کا تذکرہ کیا گیا ہے جس کے مطالعہ سے قارئین اس نابغہ روزگار شخصیت کی دعوت و عزیمت اور تجدید و اصلاح کے کارناموں سے بخوبی آگاہ ہو سکیں گے۔[12]

ابوالحسن علی ندوی

---

[12] اضافہ از ادارہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مولانا جلال الدّین رُومی

علم کلام و عقلیت کا بحران

ساتویں صدی میں سارا عالمِ اسلام علم کلام کے مسائل و مباحث سے گونج رہا تھا جو شخص علمِ کلام کی اصطلاحات اور معتزلہ و اشاعرہ پھر اشاعرہ و حنابلہ کے مختلف فیہ مسائل سے واقف نہیں ہوتا تھا، وہ پڑھا لکھا انسان نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اسی صدی کی ابتداء میں (۶۰۶ھ میں) امام رازی نے انتقال کیا تھا، جنہوں نے علم کلام کا صور اس بلند آہنگی سے پھونکا تھا کہ اس کی صدائے بازگشت کے علاوہ کوئی آواز سننے میں نہیں آتی تھی۔ عالم اسلام کے علمی و فکری حلقے استدلال و قیاس کے خوگر تھے۔ کسی شے کا وجود کسی چیز کی حقیقت، دین کا کوئی عقیدہ اس وقت تک قابل تسلیم نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک کہ اس کو عقلی دلائل، منطقی ترتیب اور فلسفیانہ مقدمات سے ثابت نہ کر دیا جاتا۔

متکلمین اشاعرہ نے عام زندگی میں اگرچہ معتزلہ اور فلسفہ پر فتح حاصل کرلی تھی اور ان کے علم کلام کے مقابلہ میں اعتزال و فلسفہ کی آواز پست ہوچکی تھی لیکن اعتزال کی روح اور عقلیت خود اپنے فاتحین کو مفتوح بنا چکی تھی۔ اشاعرہ کے علم کلام میں معتزلہ کی عقلیت پرستی کی روح سرایت کرگئی تھی۔ انہوں نے بھی عقل کو اتنی وسعت دے دی تھی کہ وہ ذات و صفات کے نازک اور ماورائے عقل (نہ کہ مخالف عقل) مسائل و تفصیلات میں آزادانہ بحث کرسکے۔ انہوں نے بھی ظواہر و محسوسات کو بڑی حد تک فیصلہ کن سمجھ لیا تھا، انہوں نے بھی دینی مسائل کے اثبات اور حقائق اشیاء کے وجود کی بنیاد استدلال و قیاس پر رکھی تھی۔

اس کا نتیجہ تھا کہ تمام عالم اسلام پر ایک لفظی و استدلالی ذوق غالب تھا۔ علم کلام نقل در نقل ہو کر رہ گیا تھا جس میں عرصہ سے کوئی جدت پیدا نہیں کی جا سکی تھی، اس کے حلقہ میں مدتہائے دراز سے امام ابوالحسن اشعری یا حجۃ الاسلام غزالی سا مجتہد اور ذہین و طباع پیدا نہیں ہوا تھا۔ قیاس و استدلال کے غلو نے دماغوں کو خواہ کتنی جولانی بخشی ہو، دلوں کی حرارت اور یقین کی روشنی کو نقصان پہنچایا تھا۔ متکلمین نے اپنی قوتِ استدلال اور مقدمات و نتائج کی آراستگی سے معترضین کی زبانوں کو خاموش کر دیا تھا، لیکن وہ قلوب کو سکینت و ایمان و اہل شک و ارتیاب کو یقین اذعان عطا کرنے میں ناکام رہے تھے، ان کے اس طریق بحث و استدلال نے دماغوں اور دلوں میں بیسیوں گرہیں ڈال دی تھیں جن کو علم کلام سلجھانے سے قاصر تھا۔ "وجدان" جو علم و یقین کا ایک بہت بڑا سرچشمہ ہے، علم کلام کی مسلسل بے اعتنائیوں بلکہ تحقیر کی وجہ سے بالکل معطل ہوتا جا رہا تھا، ظاہری حواس خمسہ کے علاوہ کسی اور باطنی حاسہ کا وجود تسلیم نہیں کیا جا رہا تھا۔ اس لیے بہت سے وہ مسائل و حقائق جو حاسۂ باطنی کے بغیر محسوس و معلوم نہیں کیے جاسکتے تھے، محل اعتراض بنے ہوئے تھے، اور ان کے انکار و نفی کا رجحان پیدا ہوتا جارہا تھا، غرض سارا عالم ایک کلامی بحران میں مبتلا تھا اور سب پر ایک "عقلی ظاہریت" چھائی ہوئی تھی۔ امت کی قوتِ عمل اور اس سے بڑھ کر "حرارت عشق" جو اس امت کا سرمایہ، اس کی طاقت کا سرچشمہ اور نبوت کا فیضان ہے، سرد ہوتی جارہی تھی، دل سوز سے خالی اور "حرارت عشق" سے عاری ہوتے جارہے تھے، فلسفیانہ مباحث اور علم کلام کی معرکہ آرائیوں نے عالم اسلام کو ایک "مدرسہ" میں تبدیل کر دیا تھا، جس میں قیل و قال تو بہت تھی، مگر "زندگی" اور محبت "معرفت" اور نگاہ "نایاب" تھی، اہل قلوب کے روحانی جزیروں میں البتہ عشق کا سرور اور یقین کا نور پایا جاتا تھا ورنہ عالم کا عالم الفاظ کے طلسم کا گرفتار اور ظواہر و محسوسات کا پرستار تھا۔

صاحبِ دل متکلم کی ضرورت

ایسی حالت میں عالم اسلام کو ایک ایسی بلند اور طاقت ور شخصیت کی ضرورت تھی جو دل دردمند اور فکر ارجمند دونوں سے فیضیاب ہو جس کے لیے عقلیات کا سمندر پایاب ہوچکا ہو اور الفاظ و ظواہر کا طلسم ٹوٹ چکا ہو، جو اپنی گرمیٔ عشق اور سوزدروں سے اس یخ بستہ عالم اسلام میں زندگی کی نئی حرارت پیدا کردے اور عقل کے اس "نگارخانہ" میں عشق کا صور پھونک دے، جو ایک ایسے نئے علم کلام کی بنیاد رکھے جو دماغوں سے زور آزمائی اور مخالفین کی زبان بندی کے بجائے دماغ کی شکن دور کردے اور دل کی گرہ کھولے اور ان کو سکینت و ایمان اور یقین و اطمینان سے بھردے، یہ شخصیت مولانا جلال الدین رومیؒ (م۶۷۲ھ) کی تھی جن کی مثنوی، علم کلام کی بے اعتدالیوں اور عقل کی "ہوس پرستی" کے خلاف ایک صدائے احتجاج بلکہ اعلانِ جنگ ہے اور ایک ایسے نئے علم کلام کی بنیاد جس کی بدلتے ہوئے عالم اسلام کو سخت ضرورت تھی۔

مختصر حالات

مؤلف "مرآۃ المثنوی" نے اپنی (غیر مطبوعہ) تصنیف "صاحب المثنوی" میں مولانا کے حالات نہایت تفصیل و تحقیق سے لکھے ہیں، یہاں اس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے [۳]۔

---

[۳] قاضی تلمذ حسین گورکھپوری مرحوم اس دورِ آخر میں مثنوی اور صاحبِ مثنوی کے بہت بڑے شیدائی اور محقق عالم تھے۔ ان کی کتاب "مرآۃ المثنوی" سے متعلق لٹریچر میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ مرآۃ المثنوی کے علاوہ (جو طبع ہو کر مقبول ہوچکی ہے) ان کی دو اور محققانہ تصانیف ہیں جو ابھی تک طبع

خاندان اور والد نامدار

محمد نام ، لقب جلال الدین، شہرت مولانا روم یا مولانا رومی کے لقب سے ہے۔ آپ کا نسب والد کی جانب سے نو واسطوں سے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے مل جاتا ہے اور ماں کی جانب سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے۔

مولانا کے آبائے کرام بلخ و اقع خراسان[14] کے رہنے والے تھے۔ مولانا کی وہیں پیدائش ہوئی۔ مولانا کے پدری و مادری سلسلہ میں اجل علماء اور سلاطین وقت ہیں، مولانا کی دادی ملکۂ جہان شاہان خوارزم کے خاندان سے تھیں۔

مولانا کے والد کا نام محمد اور لقب بہاء الدین ولد تھا۔ ان کی ولادت غالباً ۵۴۳ھ میں ہوئی۔ حضرت بہاءالدین ولد نوعمری ہی میں تمام علوم میں کامل و ماہر ہوگئے تھے ۔ آپ کے علم و فضل کی کیفیت یہ تھی کہ اقصائے خراسان سے مشکل فتاوے آپ ہی کے پاس آتے تھے، مجلس کا طریق بادشاہوں کا سا تھا۔ سلطان العلماء خطاب بھی تھا، معمول تھا کہ صبح سے دوپہر تک درس عام ہوتا۔ ظہر کے بعد اپنے خاص اصحاب کے حلقہ میں حقائق و معارف بیان فرماتے، دو شنبہ اور جمعہ کو عام وعظ کہتے، ہیبت نمایاں رہتی اور ہمیشہ مفکر معلوم ہوتے۔

مولانا کی پیدائش اور ابتدائی تعلیم

آپ کے صاحبزادہ مولانا جلال الدین رومی ربیع الاول ۶۰۴ھ کو

نہیں ہوئیں (۱) صاحب المثنوی (۲) نقد المثنوی۔ ان دو کتابوں کی اشاعت ''ادبیاتِ رومی'' میں ایک گراں قدر اضافہ اور ایک بڑی خدمت ہوگی، صاحب المثنوی دار المصنفین میں زیرِ طبع ہے۔ راقم سطور کو ان کے صاحبزادہ توکل حسین کی عنایت سے اس بیش بہا کتاب سے استفادہ واقتباس کا موقع ملا، جزاہ اللہ خیرا۔

[14] حال واقعہ ملک افغانستان (ندوی)

پیدا ہوئے۔ سلطان العلماء کے مریدان خاص میں ایک بلند پایہ بزرگ سیّد برہان الدین محقق ترمذی تھے۔ سلطان العلماء نے آپ ہی کو مولانا کا اتالیق مقرر فرمایا اور ۲۴۔۲۵ سال کی عمر تک مولانا آپ ہی کے زیرِ تربیت رہے اور اپنے والد بزرگوار کے انتقال کے بعد آپ ہی کے زیرِ ہدایت منازل سلوک طے کیں۔

والد کی بلخ سے ہجرت

مولانا کے والد ماجد کا اثر جب زیادہ بڑھا اور آپ کی دعوت و نصیحت کو حد سے زیادہ قبول عام حاصل ہوا اور مریدوں کی تعداد بے شمار ہوئی تو بعض علماء عصر کو رشک ہونے لگا۔ حضرت سلطان العلماء اپنے وعظ میں مذہب حکمائے یونان کی مذمت فرمایا کرتے کہ کچھ لوگوں نے کتب آسمانی کو پس پشت ڈال رکھا ہے اور فلسفیوں کے اذکار رفتہ اقوال کو اپنا مسلک بنا لیا ہے، یہ لوگ کیوں کر نجات کی اُمید کرسکتے ہیں، اس بر ملامت سے علماء ظاہر کے دلوں میں آپ کی طرف سے کدورت بیٹھ گئی مگر چونکہ خوارزم شاہ آپ کا نہایت معتقد تھا۔ ان لوگوں کو شکایت کا موقع نہیں ملتا تھا۔ اتفاق کہ ایک روز سلطان آپ کی زیارت کو آیا تو دیکھا کہ مجمع نہایت کثیر ہے ایک عالم سے جو رکاب شاہی میں تھے[۱۵]۔ مخاطب ہو کر کہا کہ کتنا

---

[۱۵] عام طور پر تذکروں میں ہے کہ یہ مکالمہ امام فخر الدین رازی سے ہوا۔ جو سلطان کے ساتھ تھے مصنف صاحب المثنوی کی تحقیق ہے کہ یہ ایک "تاریخی" غلطی ہے جو منقول چلی آرہی ہے، اس لیے کہ حضرت بہاء الدین ولد نے بلخ کو ۶۰۹ھ یا ۶۱۰ھ میں ترک کیا ہے۔ امام رازی نے ۶۰۶ھ میں اپنے وطن ہرات میں انتقال کیا جہاں انہوں نے اپنے انتقال سے کئی سال پیشتر سے مستقل قیام اختیار کرلیا تھا۔ مولانا روم کے فاضل سوانح نگار بدیع الزماں فروزانفر جن کی محققانہ "کتاب زندگانی مولانا جلال الدین محمد" ابھی ایران سے شائع ہو کر آئی ہے کی بھی یہی تحقیق ہے۔ یہ روایت تاریخی حیثیت سے ناقابل اعتبار ہے اور ان کی بنیاد بھی یہی ہے کہ بہاء الدین ولد کی ہجرت بقول اکثر ۶۱۰ھ کا واقعہ ہے اور "امام فخر الدین رازی ۶۰۶ھ میں ہرات میں انتقال کر چکے تھے۔ ملاحظہ ہو ص ۱۴۔ قاضی تلمذ حسین مرحوم فرماتے ہیں ممکن ہے یہ عالم

کثیر مجمع ہے۔ فاضل مذکور کو موقع ملا اور کہا کہ اگر اس کی تدبیر نہ کی گئی تو اندیشہ ہے کہ انتظام سلطنت میں خلل واقع ہو اور تدارک مشکل ہو جائے یہ بات خوارزم شاہ کے دل میں بیٹھ گئی۔ اس نے پوچھا کہ کیا تدبیر کرنا چاہئے فاضل مذکور نے یہ صلاح دی کہ خزانہ اور قلعوں کی کنجیاں مولانا کے پاس بھیج کر یہ کہلانا چاہیے کہ جمعیت و کثرت تو سب کچھ جناب کو حاصل ہے ہی، میرے پاس امور سلطنت میں سے صرف کنجیاں رہ گئی ہیں، وہ بھی حاضر ہیں۔

اس پیغام کو سن کر آپ نے ارشاد فرمایا کہ "سلطانِ اسلام سے میرا سلام کہنا اور کہنا کہ اس ملک فنا کا یہ تمام خزانہ ودفینۂ ملک و لشکر بادشاہوں کے لائق ہے، ہم درویشوں کو اس سے کیا سروکار؟ میں نہایت خوشی سے سفر کرتا ہوں کہ بادشاہ اپنے اتباع و احباب کے ساتھ یہاں باستقلال سلطنت کرے، جمعہ کو وعظ کہہ کر چلا جاؤں گا"۔

اہالی بلخ کو جب یہ حال معلوم ہوا، شہر میں ایک تہلکۂ عظیم برپا ہوگیا۔ خوارزم شاہ سخت متوہم ہوا، قاصد بھیجے اور رات کو خود مع وزیر کے آیا کہ ارادۂ سفر سے باز رہئے مگر آپ نے قبول نہ کیا۔ آخر یہ استدعا کی کہ آپ اس طرح روانہ ہوں کہ لوگوں کو خبر نہ ہو، ورنہ سخت فتنہ برپا ہوجائے گا۔ مولانا نے اس کو منظور فرمایا جمعہ کو وعظ کہا اور شنبہ کو بلخ سے بغداد کی طرف روانہ ہوگئے، اس وعظ میں خوارزم شاہ کو متنبہ کردیا کہ میرے بعد لشکر تاتار آرہا ہے[۲]۔

سید بہاء الدین رازی ہوں جو خوارزم شاہ کے مقربین میں تھے اور طبقاتِ ناصری ۳۳۵ میں ان کا ذکر آتا ہے (ندوی)

[۲] بدیع الزماں فروزانفر کا رجحان یہ ہے کہ بہاء الدین ولد کی ہجرت کا اصل سبب تاتاریوں کا عزم خراسان و ایران تھا۔ اس اطلاع سے بڑے بڑے خاندان شرفاءِ و علماء وترک وطن کررہے تھے اور محفوظ مقامات کی طرف رختِ سفر باندھ رہے تھے، ملاحظہ ہو ص ۱۵ (ندوی)۔

سلطان العلماء بلخ سے اس شان کے ساتھ روانہ ہوئے کہ جس شہر کے قریب پہنچتے تھے وہاں کے عمائد و علماء شہر سے باہر نکل کر استقبال کرتے اور نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ شہر میں لاتے تھے۔

بغداد، مکہ معظمہ دمشق اور مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے آپ ملاطیہ پہنچے، آقشہر میں آپ نے چار سال قیام فرمایا اور درس و تدریس میں مشغول رہے، آقشہر سے لارندہ تشریف لائے جو توابع قونیہ سے تھا۔

مولانا قونیہ میں

علاء الدین کیقباد سلطان روم کی خواہش و درخواست پر آپ ۶۲۶ھ میں قونیہ تشریف لے گئے، سلطان نے خود استقبال کیا، محل کے قریب گھوڑے سے اتر پڑا اور بڑی فروتنی کا اظہار کیا۔ آپ نے مدرسۂ قونیہ میں قیام فرمایا، سلطان مع اکثر امراء کے مرید ہوگیا۔

حضرت بہاء الدین ولد نے قونیہ میں دو برس قیام کے بعد ۶۲۸ھ میں انتقال فرمایا۔

اس تمام مدت میں مولانا ہمیشہ اپنے والد کے ہمراہ رہے اور علوم ظاہری و باطنی آپ سے حاصل کرتے رہے۔ ۲۲ برس کے سن میں آپ شہر (قونیہ) میں وارد ہوئے جو آئندہ آپ کا مسکن و مدفن بننے والا تھا۔

قونیہ میں سلطان کے اتالیق امیر بدرالدین گہر تاش نے آپ کے تبحر علمی اور خداداد ذہانت سے متاثر ہوکر آپ کے لیے مدرسۂ خداوند گار تعمیر کیا اور اس کے لیے بہت بڑا وقف کیا۔

سلطان علاءالدین کیقباد آپ کی بڑی تعظیم کرتا تھا اور آپ سے بڑی عقیدت رکھتا تھا۔ سلطان نے جب قونیہ کا قلعہ تیار کیا تو ایک روز آپ سے سیر کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا کہ "دفع سیل و منع خیل کے لیے اچھا ہے، مگر

مظلوموں کی تیر دعا کا کیا علاج آپ نے سوچا ہے، جو ہزاروں، لاکھوں برجوں سے گزر جاتی، اور عالم کو خراب کرڈالتی ہے، عدل و انصاف کا قلعہ بنائیے کہ اس میں دنیا کا امن اور عاقبت کی خیر ہے" سلطان پر اس نصیحت کا بڑا اثر ہوا۔

مولانا بہاءالدین ولد کے انتقال کے بعد سلطانِ وقت اور علماء واکابر کے اتفاق رائے سے آپ مولانا کے جانشین ہوئے اور آپ نے سلسلۂ درس و تدریس اور تلقین وارشاد کو بدستور جاری رکھا، سیّد برہان الدین محقق ترمذی جو آپ کے اتالیق رہ چکے تھے اور ترمذ کو چلے گئے تھے، مولانا علاءالدین ولد کے انتقال کے بعد قونیہ تشریف لائے مولانا آپ کے مرید ہوگئے اور اپنے والد ماجد کے بعد مراتب سلوک آپ ہی سے طے کیے، ۹ برس مولانا کی آپ سے صحبت رہی ۶۳۷ھ میں انہوں نے انتقال کیا۔

آپ کے تعلیمی سفر اور مشاغل

۶۳۰ھ میں مولانا نے مزید تکمیل علوم و اکتساب فیض کے لئے شام کا سفر کیا اور حلب میں وارد ہوئے۔ سلطان صلاح الدین کے فرزند الملک الظاہر نے قاضی بہاء الدین ابن شداد کی تحریک سے جو اجلۂ علماء میں سے تھے، ۵۹۱ھ میں متعدد بڑے بڑے مدرسے قائم کیے تھے جس کی وجہ سے حلب بھی دمشق کی طرح مدینہ العلوم بن گیا تھا۔

حلب میں مولانا مدرسہ حلاویہ میں قیام پذیر ہوئے اور کمال الدین ابن العدیم سے استفادہ کیا مولانا یہاں اگرچہ تحصیل علم میں مشغول تھے مگر آپ کے کمال کا یہ حال تھا کہ بقول سپہ سالار جو مشکل مسائل کسی سے حل نہ ہوتے تھے، وہ آپ ہی حل کرتے تھے، اور ایسے وجوہ بیان کرتے تھے، جو کسی کتاب میں درج نہ ہوتے۔

حلب سے مولانا دمشق تشریف لے گئے یہاں آپ نے مدرسہ مقدسیہ

میں قیام فرمایا۔ دمشق اس وقت مجمع علماء تھا۔ سپہ سالار نے لکھا ہے کہ دمشق میں شیخ محی الدین ابن عربی، شیخ سعد الدین حموی، شیخ عثمان رومی، شیخ اوحدالدین کرمانی، شیخ صدرالدین قونوی سے مولانا کی صحبت رہا کرتی اور باہم دگر حقائق و معارف بیان ہوتے تھے۔

۶۳۴ھ یا ۶۳۵ ھ میں آپ نے دمشق سے واپس آکر قونیہ میں مستقل قیام اختیار کیا، سیّد برھان الدین کے انتقال (۶۳۷ھ) کے بعد ۵ سال تک آپ علماء ظاہر کے لباس میں رہے اور علمی و تدریسی مشاغل میں ہمہ تن منہمک رہے۔ ۶۳۸ھ میں شیخ محی الدین ابن عربی نے انتقال کیا۔ جو بزمِ علم آپ کے گرد جمع تھی اس کے اکثر افراد قونیہ میں آگئے جن میں شیخ صدر الدین بھی تھے، مشرق کی طرف سے جو علماء و فضلاء وہاں کی تباہیوں سے پریشان ہوکر روم کا رخ کرتے تھے، وہ بھی اکثر قونیہ کو اپنا ملجا وماویٰ بناتے، اس طرح قونیہ اس زمانہ میں مدینۃ العلماء بن گیا اور ان علماء میں مولانا کی حیثیت سب سے بلند تھی، اس زمانہ میں مولانا کے وہی اشغال تھے جو علماء ظاہر کے ہوتے ہیں یعنی درس و تدریس وعظ و تذکیر اور فتاویٰ نویسی، مولانا بہت زیادہ وقت شغل تدریس میں صرف کرتے۔ خود آپ کے مدرسہ میں چارسو ۴۰۰ سے زیادہ طلبہ تھے۔

درس و تدریس کے علاوہ مولانا کا دوسرا شغل یا فرض وعظ کہنا تھا فتویٰ نویسی کا شغل بھی مستقل تھا، بیت المال سے مولانا کے لیے ایک دینار مقرر تھا۔ اسے اسی فتویٰ نویسی کا معاوضہ تصور فرماتے تھے اور اس معاملہ میں اس قدر سخت تھے کہ جب فقر کا رنگ غالب ہوا اور مجلس میں مستغرق رہنے لگے، اس وقت بھی حکم تھا کہ جس وقت کوئی فتویٰ آئے فوراً خبر کی جائے، قلم ودوات ہمہ وقت ساتھ رہتا تھا۔

انقلابِ حال

یہ حالت ۶۴۲ھ تک قائم رہی، اس کے بعد مولانا کی زندگی میں وہ واقعہ پیش آیا جس نے زندگی میں انقلابِ عظیم پیدا کر دیا اور مولوی جلال الدین تونوی کو مشہور روزگار مولانائے روم بنادیا۔ یہ واقعہ مولانا کی شمس تبریز سے ملاقات اور ان کی ذات سے شیفتگی و فنائیت تھی۔

مولوی ہر گز نہ شد مولائے روم   تا غلام شمس تبریزی نہ شد

شمس تبریز

(محمد بن علی بن ملک داد) شمس تبریز کا نسب اور وطن کیا تھا؟ آپ کے مخالفین نے جہاں اور الزامات آپ پر لگائے تھے، وہاں ایک الزام یہ بھی تھا کہ آپ کا نسب نامعلوم ہے[1]۔

نے ور واصل ونے نسب پیدا است   می نہ دانیم ہم کہ اور کجا است

آپ بچپن سے اعلیٰ استعداد اور جذبۂ عشق و محبت کے حامل تھے، "مناقب العارفین" میں خود آپ ہی کی زبانی منقول ہے کہ ابھی سن بلوغ کو بھی نہیں پہنچے تھے کہ آنحضرت ﷺ کے عشق میں تیس تیس چالیس چالیس روز تک آپ کو غذا کی خواہش نہیں ہوتی تھی، علوم ظاہری سے فارغ ہونے کے بعد آپ شیخ ابو بکر سلّہ باف کے مرید ہوئے، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ

---

[1] بعض تاریخوں میں ہے کہ آپ حسن بن صباح اسماعیلی کے جانشین و رفیق و طریق کے بزرگ امید کی نسل سے تھے۔ ان کے والد جلال الدین حسن جب منصب امامت پر فائز ہوئے تو انہوں نے اپنے بزرگوں کا طریقہ ترک کر کے صحیح اسلامی عقائد اختیار کیے اور نو مسلمان کے لقب سے مشہور ہوئے۔ لیکن یہ روایات مشتبہ اور قابل بحث ہیں، ملاحظہ ہو زندگانی مولانا جلال الدین محمد ص ۵۳۔۵۴ (ندوی)

شیخ زین الدین سنجاسی[18] کے مرید تھے ۔بعض روایتوں میں دوسرے نام لیے گئے ہیں، ممکن ہے آپ نے سب سے اکتساب فیض کیا ہو۔

جب آپ کو اس طرح سیری نہ ہوئی تو آپ اطراف عالم میں مردانِ خدا کی تلاش میں پھرنے لگے، یہ سفر اس طرح کرتے تھے کہ خود آپ کی ولایت و کمال سے لوگ آگاہ نہیں ہوتے تھے، نمد سیاہ پہنتے اور جہاں جاتے سرائے میں قیام کرتے۔ دروازہ پر قیمتی قفل لگا دیتے کہ لوگ سمجھیں کہ کوئی بڑا تاجر ہے مگر اندر سوائے بوریہ کے کچھ نہ ہوتا کثرت اسفار کی وجہ سے لوگ آپ کو "شمس پرندہ" کہنے لگے تھے۔ تبریز، بغداد، اردن، الروم، قیصریہ و دمشق کا سفر فرمایا، معاش کا یہ طریقہ تھا کہ ازاربند بن لیا کرتے اور اسی کو بیچ کر کام چلاتے تھے، غذا کی کیفیت یہ تھی کہ دمشق میں ایک برس رہے، ہفتہ میں ایک پیالہ سری کا شوربا اور وہ بھی بے روغن پی لیا کرتے، کسی کو اپنی صحبت کا متحمل نہیں پاتے تھے،اکثر یہ دعافرماتے کہ خدایا کوئی رفیق ایسا عطا کر جو میری صحبت کا متحمل ہو۔

مولانا کی ملاقات اور تغیر عظیم

آپ کے شیخ نے آپ سے فرمایا کہ روم جاؤ، وہاں ایک دل سوختہ ہے،اسے روشن کر آؤ، دو شنبہ ۲۶ جمادی الاخریٰ ۶۴۲ھ کو قونیہ پہنچے اور شکر فروشوں کے محلہ میں قیام فرمایا، ایک روز دیکھا کہ مولانا سوار چلے آرہے ہیں اور لوگ گردو پیش سے استفادہ کررہے ہیں۔ شمس نے آگے بڑھ کر پوچھا کہ ریاضات و علوم کی غرض کیا ہے؟ مولانا نے کہا آداب و شریعت کا جاننا! شمس نے کہا نہیں، غرض یہ ہے کہ معلوم تک رسائی ہوجائے، اور حکیم سنائی کا یہ شعر پڑھا۔

---

[18] بدیع الزماں فروزانفر نے بجائے زین الدین سنجاسی کے رکن الدین سنجاسی لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ سنجاسی، زنجان کے توابع میں سے ہے۔ ص ۵۶ لیکن تاریخی حیثیت سے ان کو اس روایت کی صحت میں کلام ہے۔(ترمذی)

علم کز تو ترا نا بستا ند　　جہل ازاں علم بہ بود بسیار

مولانا اس سے متغیر و متحیر ہوئے اور تیر نشانہ پر بیٹھا[19]۔

مولانا حضرت شمس کو ہمراہ لے کر اپنے مقام پر آئے اور بقول افلاکی چالیس روز تک حضرت شمس کے ساتھ ایک حجرہ میں رہے جس میں کوئی داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ سپہ سالار نے لکھا ہے کہ چھ ماہ تک صلاح الدین زرکوب کے حجرہ میں دونوں بزرگ عزلت نشین رہے، سوائے شیخ صلاح الدین زرکوب کے کسی کی مجال نہ تھی کہ حجرہ میں داخل ہوسکے۔

شمس کی ملاقات نے مولانا کو نئی روح اور حقائق و اذواق کی نئی دنیا عطا کی وہ خود فرماتے ہیں ؎

شمس تبریزی بما راہِ حقیقت بنمود　　از فیض قدم اوست کہ ایماں داریم

ابھی تک مولانا استاذ دوراں تھے اور خود صاحب سجادہ تھے اور علماء و طلبہ و صوفیہ مستفید و طالب۔ اب مولانا مستفید و طالب تھے اور شمس تبریز صاحب فیض و ارشاد مولانا کے صاحبزادہ سلطان ولد فرماتے ہیں

شیخ استاذ گشت نو آموز　　درس خواندی بخد تش ہر روز

گرچہ در علم فقر کامل بود　　علم نوبود کہ بوے بہ نمود

خود مولانا اپنی زبان سے فرماتے ہیں ؎

زاہد بودم ترنہ گویم کردی　　سرفتنۂ بزم و بادہ جویم کردی

---

[19] صاحب المثنوی کی مختلف روایات میں سے اس روایت کو انتخاب کیا گیا ہے، یہ روایت تذکرۂ دولت شاہ کی ہے۔ ص ۱۹۷، ۱۹۶ فروزانفر نے اس سلسلہ کی تمام روایات کو نقل کرکے ان سے بے اطمینانی کا اظہار کیا اور شمس سے مولانا کے تاثر فریفتگی کا سبب کسی اچانک واقعہ اور تصرف کو قرار نہیں دیا بلکہ مردانِ خدا کی تلاش عشق و اہل عشق کے مولانا کی مناسبت فطری کو قرار دیا ہے، ملاحظہ ہو زندگانی جلال الدین محمد ص ۶۱۔۶۸ (ندوی)

سجادہ نشیں باوقارے بودم　　　بازیچۂ کو دکاں کویم کردی

نتیجہ یہ ہوا کہ شمس کی ملاقات کے بعد مولانا نے درس و تدریس، وعظ گوئی وغیرہ سب یک قلم ترک کردی، خود فرماتے ہیں۔

عطارد وارد فتر پارہ بودم　　　زوشت او زمانے می نشستم
چودیدم نوح پیشانی ساقی　　　شدم مست و قلم ھارا شکستم

شورش عام

مولانا جب اس طرح ہر بات میں حضرت شمس کی پیروی کرنے لگے اور تمام تعلقات منقطع ہونے لگے تو یہ امر مولانا کے شاگردوں اور مریدوں پر سخت شاق گذرا، ایک شورش کی سی کیفیت پید اہوگئی،ایک برہمی کے ساتھ گو نہ حیرت بھی شامل تھی، شمس کے حالات سے لوگ واقف نہ تھے، مریدوں کا خیال تھا کہ ہم نے عمریں مولانا کی خدمت میں گزاریں، مولانا کی کرامتوں کو دیکھا، تمام اطراف و اکناف میں آپ کی شہرت کا باعث ہوئے۔ اب ایک بے نام و نسب شخص آیا اور مولانا کو سب سے الگ کرلیا کہ آپ کی صورت تک دیکھنا نصیب نہیں ہوتی، درس و تدریس، وعظ سب بند ہوگئے۔ضرور یہ کوئی ساحر یا مکار شخص ہے ورنہ اس کی کیا ہستی ہے کہ ایسے پہاڑ کو تنکہ کی طرح بہالے جائے۔

غرض سب کے سب شمس کے دشمن ہوگئے۔مولانا کے سامنے کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔ادھر ادھر ٹل جاتے تو برا بھلا کہتے اور رات دن اسی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے کہ کسی طرح حضرت شمس کو وہاں سے نکالیں کہ پھر حسب سابق مولانا کی صحبت سے فیض یاب ہوسکیں۔

شمس کی غیبت (غائب ہونا)

حضرت شمس الدین ان لوگوں کی گستاخیوں کا تحمل کرتے رہے اور سمجھتے رہے کہ مولانا کی وفورِ عقیدت کی وجہ سے یہ لوگ اس طرح آزردہ ہیں مگر جب

معاملہ حد سے تجاوز کر گیا اور آپ نے سمجھ لیا کہ اب انجام اس کا فتنہ و فساد پر ہوگا تو آپ ایک دن خاموشی کے ساتھ قونیہ سے نکل گئے۔ افلا کی نے اس غیبت اوّل کی تاریخ روز پنجشنبہ یکم شوال ۶۴۳ھ بتائی ہے۔ اس طرح بار اول قونیہ میں آپ کا قیام سوا برس رہا۔

شمس کی جدائی مولانا پر سخت شاق گزری، مریدوں نے جو کچھ سوچا تھا اس کے برعکس واقع ہوا۔ اس کے بجائے کہ شمس کے چلے جانے کے بعد مولانا ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے جو کچھ توجہ تھی وہ بھی جاتی رہی اور ان ناقصوں کی وجہ سے اصحابِ صدق و وفا بھی مولانا کی صحبت سے محروم ہو گئے۔

مولانا کی بیقراری اور شمس کی واپسی

بقول سپہ سالار انقطاع کلی کی یہ حالت اس وقت تک قائم رہی کہ دمشق سے شمس الدین کا خط اچانک مولانا کے نام آیا۔ اس خط کے پانے کے بعد مولانا کی کچھ حالت بدلی اور شمس کے شوق و عشق میں سماع کی جانب متوجہ ہوئے اور جن لوگوں نے حضرت شمس کے خلاف حرکات میں شرکت نہیں کی تھی ان پر حسب سابق عنایت فرمانے لگے اس عرصہ میں مولانا نے حضرت شمس کی خدمت میں چار منظوم خطوط لکھے جن میں اپنی کیفیت اور اشتیاق ملاقات کی بیتابی کا ذکر کیا ہے، پہلے نامۂ شوق میں فرماتے ہیں ۔

ایها النور فی الفواد تعال

غایة الوجد والمراد تعال

ایها السابق الذی سبقت

منك مصدوقة الوداد تعال

چوں بیائی زہے کشاد و مراد

چوں نیائی زہے کساد تعال

انت کالشمس اذ دنت ونأت

یاقریباً علی البعاد تعال

اس اثنا میں شورش بہت کچھ فرو ہوگئی، اطمیان ہوجانے کے بعد کہ اب لوگوں نے شمس کی مخالفت ترک کردی ہے، مولانا نے شمس کو واپس بلانے کی تدبیر کی، صاحبزادہ سلطان ولد سے فرمایا کہ تم میری طرف سے اس شاہ مقبول کی طرف جاؤ اور یہ لے جاکر ان کے قدموں پر نثار کرو اور میری جانب سے کہو کہ جن مریدوں نے گستاخی کی تھی، وہ سب صدق دل سے توبہ کرتے اور التجا کرتے ہیں کہ جو خطا ہوئی درگزر فرمائیں اور اس جانب قدم رنجہ فرمائیں، ان کے ہاتھ جو نیاز نامہ بھیجا اس میں اس مفارقت سے اپنی حالت بیان کرتے ہیں۔

که ازاں دم که تو سفر کردی — از حلاوت جدا شدیم چو موم

همه شب چو شمع مے سوزیم — ز آتشش جفت و زانگبین محروم

در فراق جمالِ تو مارا — جسم ویران و جان ازو چوں بوم

ہاں عناں رابدیں طرف برتاب — زفت کن پیل عیش را خرطوم

بے حضورت سماع نیست حلال — ہمچو شیطان طرب شده مرجوم

یک غزل بے توہیچ گفتہ نشد — تا سید آں مشرفہ مفہوم

پس بذوق سماع نامۂ تو — غزل پنج و شش بشد منظوم

شام از تو چو صبح روشن باد — اے بتو فخر شام و ارمن و روم

سلطان ولد حضرت شمس کو عزت و احترام شاہانہ کے ساتھ قونیہ لائے۔

شمس کی دوبارہ غیبت (غائب ہونا)

حضرت شمس کے قونیہ پہنچنے پر مولانا کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی جن

لوگوں سے گستاخیاں سرزد ہوئی تھیں سب نے آ آکر معافی مانگی۔ ایک مدت تک یہ صحبت بے کدورت اسی طرح بر قرار رہی، اس اثنا میں شمس کے ساتھ مولانا کا اخلاص و اتحاد پہلے سے زیادہ بڑھتا گیا مگر اس دورِ خرمی کو زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ پھر آزردگی کے اسباب پیدا ہوگئے۔ حضرت شمس کا قیام مولانا کے تابخانہ کے قریب ہی دالان "صفہ" میں ایک طرف تھا۔ شمس وہاں اپنی اہلیہ کے ساتھ جن سے قونیہ میں عقد ہوا تھا مقیم تھے۔ مولانا کے منجھلے صاحبزادہ (چلپی علاء الدین) جب مولانا کے گھر جاتے تو اسی طرف سے ہوکر گزرتے، مولانا شمس الدین کو یہ بات ناگوار ہوتی، کئی مرتبہ مشفقانہ طور پر سمجھایا، علاء الدین کو یہ بات شاق گزری، ان کے دل میں کچھ اس بات سے بھی کدورت تھی کہ حضرت شمس الدین سلطان ولد پر زیادہ نظرِ عنایت رکھتے ہیں، اس کا چرچا لوگوں سے بھی کیا جو لوگ اس قسم کے موقع پر منتظر تھے، انہوں نے اور بھی چڑھائے اور کہنے لگے کہ یہ بھی خوب ہے کہ ایک بیگانہ نے آکر مولانا کے مکان پر قبضہ کرلیا ہے اور فرزند کو گھر میں آنے نہیں دیتا۔

حضرت شمس الدین نے محض لطف و حلم کی وجہ سے مولانا سے اس کا کچھ ذکر نہیں کیا مگر جب معاملہ حد سے گزر گیا تو سلطان ولد سے بر سبیل حکایت یہ فرمایا کہ ان لوگوں کی حرکات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مرتبہ اس طرح غائب ہوں گا کہ پھر کسی کو پتہ نہ چلے گا، مولانا کی بعض غزلوں سے مترشح ہوتا ہے کہ مولانا بھی بالکلیہ اس سے بے خبر نہ تھے بلکہ ان کو اس کا اندیشہ تھا اور انہوں نے اشعار میں اس سے باز رہنے کی منت سماجت کی ہے۔

بہرحال لوگوں میں حضرت شمس الدین کے خلاف خیالات پھر جوش زن ہوگئے تھے اور آپ خود ہی آزردہ خاطر ہوگئے، نتیجہ یہ ہوا کہ آپ دفعۃً غائب

ہو گئے۔[20]

ناگہاں گم شد از میانِ ہمہ　　تارود ازدل اندہان ہمہ

مولانا کی بیتابی

مولانا جب صبح کو مدرسہ تشریف لائے اور شمس کو گھر میں نہ دیکھا تو چیخ اٹھے اور سلطان ولد کے خلوت خانہ پر جاکر آواز دی، "بہاء الدین چہ خفتہ؟ بر خیز و طلب شیخت کن کہ باز مشام جان را از فوائح لطف اوخالی می یابیم"۔

دو تین روز ہر طرف جستجو کرتے رہے، مگر کہیں حضرت شمس کا پتہ نہ چلا، اس مرتبہ شمس کی غیبت سے مولانا کا حال پہلے سے بھی زیادہ متغیر ہو گیا۔

شیخ گشت از فراق او مجنون　　بے سروپاز عشق اوچو ذوالنون

جو لوگ حضرت شمس کی آزردگی کا باعث ہوئے تھے، مولانا نے ان سب کو قطعاً اپنی صحبت سے خارج کر دیا، لیکن سابق کے برخلاف، اس مرتبہ آپ نے غزل گوئی اور سماع میں اپنا وقت صرف کرنا شروع کیا۔ یہ ۶۴۵ھ کا واقعہ ہے۔

حضرت شمس کے غائب ہو جانے کے بعد مولانا نے دو روز ہر طرف آپ کی تلاش کی مگر جب کسی طرح آپ کا کچھ پتہ نہ چلا تو مولانا کی حالت متغیر ہونا شروع ہوئی، طریق سماع تو آپ پہلے ہی اختیار کر چکے تھے۔ اب یہ حالت ہوئی کہ

---

[20] بعض لوگوں نے کہا ہے کہ قونیہ میں کچھ لوگوں نے حضرت شمس کو قتل کر دیا اور مولانا نے فرمایا: يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ لیکن فروزانفر نے غیبت کی اسی روایت کو ترجیح دی ہے کہ سلطان ولد سب سے قریب تر اور حالات سے باخبر تھے ان کی روایت اس باب میں سب سے زیادہ قابل اعتماد ہے اس لیے شمس کے قتل کی روایت قابل اعتبار نہیں، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اگر شمس قتل کر دیے گئے ہوتے اور مولانا کو اس واقعہ کا علم ہوتا تو ان کی تلاش میں سرگردانی نہ ہوتی۔ (زندگانی ص ۸۳-۸۴) (ندوی)

ایک دم سماع کے بغیر نہیں گزرتا تھا۔ مدرسہ میں ٹہلا کرتے تھے اور آشکارو نہان شوروفریاد کرتے تھے، تمام شہر میں غلغلہ پڑگیا، اسی زمانہ میں مولانا نے حضرت شمس کے فراق میں بہت کثرت سے اور نہایت ہی دل دوز غزلیں کہیں۔ آپ کی درد انگیز فراقیہ غزلیں زیادہ تر اسی زمانہ کی ہیں۔

اس تمام جان گدازی و بے قراری کے باوجود مولانا کے دل سے یہ خیال محو نہ ہوسکا کہ رومیوں کی خانہ جنگی، مصریوں کی ترکتازی اور تاتاریوں کی تاراجی کے باعث سارا ملک تہ و بالا ہورہاہے، معلوم نہیں اس عالم آشوب میں حضرت شمس پر کیا گزری؟

شمس الدین کے غائب ہوجانے کے بعد ان کے اشتیاق میں مولانا کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی شخص جھوٹوں بھی کہہ دیتا کہ میں نے حضرت شمس کو فلاں جگہ دیکھا ہے تو مولانا لباس تک اتار کر اس کی نذر کردیتے شکرانہ دیتے اور بہت کچھ اظہار شکر کرتے۔

سفر شام اور سکون خاطر

اسی جوش و خروش کے عالم میں مولانا نے سفر کا ارادہ کیا اور شام کی طرف روانہ ہوگئے۔ آپ کے اصحاب بھی آپ کے ساتھ چل کھڑے ہوئے۔ اسی طرح دمشق پہنچے اور وہاں بھی لوگوں کے دلوں میں آتش عشق بھڑکا دی۔ تمام لوگ حیران تھے کہ ایسا عالم و فاضل کیوں اس طرح دیوانہ ہورہاہے، شمس تبریز کیا چیز ہیں جو کہ ایسا فرد فرید ان کے پیچھے یوں مارا مارا پھر رہاہے، یہ راز کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

جب دمشق میں شمس کا کچھ پتہ نہ چلا اس وقت مولانا نے فرمایا کہ میں اور شمس دو نہیں ہیں، وہ اگر آفتاب ہیں تو میں ذرہ ہوں، وہ اگر دریا ہیں تو میں قطرہ ہوں، ذرہ کی ہستی آفتاب ہی سے ہے اور قطرہ کی تری دریا ہی سے ہے، بس فرق

کیا ہوا۔ چند روز بعد آپ نے شام سے روم کی جانب مراجعت فرمائی۔

چند برس قونیہ میں قیام فرمایا مگر پھر عشق نے جوش کیا اور کچھ لوگوں کو لے کر دمشق کی طرف روانہ ہوئے اور آخر پھر ۔۔۔۔ قونیہ تشریف فرما ہوئے اوراس مرتبہ یہ خیال لے کر آئے کہ میں خود عین شمس ہوں، شمس کی جستجو کیا تھی درحقیقت خود اپنی ہی جستجو کر رہا تھا۔ اس مرتبہ قونیہ اس خیال کے ساتھ واپس آئے کہ شمس میں جو کچھ تھا وہ خود مجھ میں موجود ہے۔

اس مرتبہ دمشق سے واپس آنے کے بعد حضرت شمس کے ملنے سے بالکل مایوس ہوگئے تھے مگر جس کیفیت کو آپ شمس میں ملاحظہ فرماتے تھے اسے اب خود اپنے میں ملاحظہ فرمانے لگے۔ سلطان ولد کے الفاظ ہیں کہ اگرچہ مولانا قدس اللہ سرہٗ شمس الدین تبریزی را عظم اللہ ذکرہٗ بصورت در دمشق نیافت بمعنی درخود بیافت زیر آں حال کہ شمس الدین راںود حضرتش راہماں حاصل شد"۔

شیخ صلاح الدین زرکوب

دمشق سے دوسری مرتبہ آنے کے بعد مولانا کچھ دنوں ساکن رہے، اس کے بعد آپ نے شیخ صلاح الدین کو اپنا ہمراز و خلیفہ بنایا ۶۴۷ھ میں اپ نے ان کو اپنا جلیس خاص بنایا اور حضرت شمس الدین کے بجائے ان کو اپنا معین ودمساز قرار دیا[1]۔

شہ صلاح الدین زبعد شمس دین گشت او را اندریں ورزش معین
حال وقالش از وجودش می فزود سرہائے نادراز وے می شنود

---

[1] فروز انفر لکھتا ہے "مولانا از دید ار شمس نومید گشت بتامی دل وہمگی ہمت روئے در صلاح آور اور الشیخی و خلیفتی" وسر لشکری جنود اللہ" منصوب فرمودویاراں رابا طاعت دے مامور ساخت ص ۹۳(ندوی)

شیخ صلاح الدین قونیہ کے قریب کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے، غریب والدین کی اولاد تھے، جو ماہی گیری کیا کرتے تھے خود شیخ صلاح الدین نے زرکوبی کا پیشہ اختیار کیا۔ ابتدائے حال سے امانت و دیانت میں مشہور تھے، سید برہان الدین جب قونیہ آئے تو آپ ان کے مرید ہوگئے اور ان کی نظروں میں اختصاص خاص پیدا کیا۔ سید کے انتقال کے بعد مولانا سے تجدید بیعت کی، انتقال سے دس برس قبل مولانا سے آپ کو وہ قرب حاصل ہوا۔ اس دس سالہ مدت میں آپ مولانا کے خلیفۂ خاص رہے۔ شیخ نے یکم محرم ۶۵۷ھ میں انتقال فرمایا۔

لوگوں میں اس قرب و اختصاص سے پھر شورش برپا ہوئی۔ اب لوگوں کو شکوہ تھا کہ ان سے تو شمس تبریز ہی بہتر تھے، وہ بہرحال صاحبِ علم تھے، یہ صاحب تو یہیں کے رہنے والے ہیں، سب جانتے ہیں کہ ایک عامی آدمی ہیں، عمر بھر ورق کوٹتے رہے، اب مولانا کے رفیق بنے ہیں، حیرت ہے کہ مولانا اس رتبہ اور پایہ کے باوجود ایسے شخص کی تعظیم و تکریم میں یہ مبالغہ کرتے ہیں، شیخ نے سنا تو فرمایا کہ لوگوں کو ملال اس کا ہے کہ مولانا نے مجھے سب میں مخصوص کرلیا ہے مگر اصل بات کو نہیں سمجھتے کہ مولانا خود اپنے ہی عاشق ہیں، میں تو محض ایک حیلہ ہوں"۔[۲۲]

دس برس کی خدمت و صحبت کے بعد شیخ ناگہاں بیمار ہوئے اور یکم محرم کو نہایت طمانیت قلب کے ساتھ اس دار غرور سے دار سرور کی طرف سفر کیا۔

---

[۲۲] بدیع الزمان فروز انفرزندگانی مولانا جلال الدین میں لکھتا ہے "مولانا بکوری چشم منکران حسود دیدۂ برصلاح الدین گماشت و ہماں عشق و دل باختگی کہ باشمس داشت بادے بنیاد نہاد واز انجاکہ صلاح الدین مردے ورام و نرم و جذب و ارشادش بنوع دیگر بود شورش و انقلاب مولانا آرام ترگردید واز بے قراری بقرار باز آمد برائے شکستن خمار ہجران شمس از پیمانہ وجود و طلب ہائے سبک می نوشید" ص ۱،۲،۳

چلپی حسام الدین

شیخ صلاح الدین کے انتقال کے بعد مولانا نے چلپی[23] حسام الدین ابن اخی ترک کو اپنا نائب اور خلیفہ بنایا، چلپی حسام الدین مولانا کے ممتاز مریدوں میں سے تھے اور مولانا کے انتقال کے بعد ۱۱ برس تک مولانا کی خلافت کے فرائض انجام دیے۔ آپ اصلاً ترک اور وطناً ارموی تھے اور روم کے مشہور اور ذی اثر خاندان اخی سے تعلق رکھتے تھے[24]۔

حضرت شمس الدین تبریزی اور شیخ صلاح الدین سے بھی آپ کو ارادت تھی اور ان لوگوں کے فیض سے بھی آپ بیش از بیش متمتع ہوئے تھے۔

حضرت حسام الدین چلپی نے اپنے تمام ملازموں اور غلاموں کو حکم دے دیا کہ اپنے طور پر کام کریں، آہستہ آہستہ اپنا کل مملوکہ مولانا کی خدمت میں صرف کردیا۔ آخر میں غلاموں کو بھی آزاد کردیا۔ مولانا کا پاس ادب اس قدر ملحوظ تھا کہ مولانا کے وضوخانہ میں کبھی وضو نہ کرتے، سخت سے سخت سردی ہوتی، برف پڑتی ہوتی مگر گھر جاکر وضو کرکے آتے، دوسری طرف مولانا بھی آپ سے اس طرح پیش آتے کہ دیکھنے والوں کو گمان ہوتا کہ مرید ہیں[25]۔

---

[23] چلپی ترکی زبان میں سیدی کا ہم معنی ہے۔

[24] فروز انفر نے ان کی تاریخ ولادت ۶۲۲ھ لکھی ہے۔

[25] مولانا کو جو کچھ فتوحات ہوتیں سب چلپی کے پاس بھیج دیتے۔ صاحبزادہ سلطان ولد نے ایک مرتبہ شکایت کی تو فرمایا: "واللہ باللہ تاللہ من کہ اگر صد ہزار کال زاہد را حالت مخمصہ واقع شود وبیم ہلاکت باشدوما رایگتانان باشد آن راہم بحضرت چلپی فرستیم" مولانا کو ان کے بغیر انبساط و شیفتگی نہیں ہوتی تھی۔ جس مجلس میں چلپی نہ ہوتے مولانا کی طبیعت میں جوش وگرمی نہ پیدا ہوتی اور اسرار و معرفت کی باتیں نہ کرتے جن لوگوں کو یہ حقیقت معلوم تھی وہ مجلس میں سب سے زیادہ اس کا اہتمام کرتے کہ حضرت چلپی موجود ہوں تاکہ دریائے فیض جاری ہو۔ (ملاحظہ ہو

مثنوی کی تحریک

مثنوی شریف کی تصنیف اسی زمانے کا کارنامہ ہے۔ اس میں حضرت حسام الدین کی تحریک کو بہت بڑا دخل ہے بلکہ یہ کہنا کچھ بیجا نہ ہوگا "مثنوی شریف کا وجود میں آنا آپ ہی کی وجہ سے ہوا"[۲۶]۔

زندگانی ص ۱۰۵) ندوی

[۲۶] فروز انفر نے لکھا ہے کہ مثنوی کی تالیف چلپی حسام الدین کی فرمائش و طلب سے ہوئی۔ انہوں نے لکھا ہے کہ چلپی دیکھتے تھے کہ مولانا کے احباب و متبعین شیخ عطارو سنائی کی تصنیفات و کلام کے مطالعہ میں مصروف رہتے ہیں۔ مولانا کی غزلیات کا اگرچہ بڑا ذخیرہ ہے مگر اس میں حقائق تصوف و دقائق سلوک سے زیادہ مولانا کی گرمی طبع و جوش عشق ہے وہ موقع کے منتظر تھے ایک رات مولانا کو تنہا دیکھ کر انہوں نے عرض کیا کہ کوئی کتاب حدیقۂ سنائی یا منطق الطیر کے طرز پر لکھی جائے۔ مولانا نے سنتے ہی اپنے عمامہ سے ایک کاغذ نکالا جس میں ۱۸ شعر لکھے ہوئے تھے، پہلا شعر وہ تھا جس کو مثنوی کا آغاز اور مطلع بننا نصیب ہوا۔

بشنواز نے چوں حکایت می کند　　وز جدائی ہا شکایت می کند

آخری مصرعہ تھا ؎

پس سخن کو تاہ باید و السلام

پس یہ مثنوی کی تالیف کا آغاز تھا مولانا برجستہ اشعار زبان مبارک سے ادا کرتے اور مولانا حسام الدین لکھتے جاتے۔ لکھ لینے کے بعد حسام الدین ان کو بلند طور پر خوش آوازی کے ساتھ پڑھتے۔ بعض مرتبہ پوری پوری رات اسی مشغلہ میں گزر جاتی اور مثنوی کی تالیف شام سے صبح تک جاری رہتی۔ مثنوی کی جلد اوّل مکمل ہوئی تھی کہ حسام الدین کی اہلیہ نے انتقال کیا اور حسام الدین کی طبیعت پر سخت اثر پڑا اور وہ مضمحل ہوگئے۔ ان کے اضمحلال سے مولانا کی طبیعت بھی رک گئی اور دو سال تک مثنوی کا سلسلہ بند رہا۔ پھر دوبارہ حسام الدین کی تحریک اور تقاضا سے اس کا سلسلہ شروع ہوا اور مولانا کی وفات تک جاری رہا۔ یہ مدت ۱۵ سال کی تھی۔(زندگانی مولانا جلال

رفقاء کے انتخاب کا سبب

مولانا کو کسی نہ کسی رفیق کے بغیر راحت نہیں ملتی تھی، شمس الدین کے بعد صلاح الدین اور صلاح الدین کے بعد حسام الدین آپ کے ہمراز و دمساز رہے بلکہ سلسلۂ خیال کو اور آگے بڑھایا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ سید بہاء الدین ترمذی بھی اسی زمرہ میں داخل تھے، اگرچہ دوسری حیثیت سے تھے، سیّد موصوف کے انتقال اور شمس کی آمد کے درمیان پانچ برس کا زمانہ مولانا نے اس طرح گزارا گویا اس دوران میں آپ کچھ کمی محسوس کرتے تھے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مولانا کے باطن میں جو کمالات مخفی تھی، ان کے اظہار کے لیے کسی نہ کسی محرک کی ضرورت تھی، "دیوان و مثنوی" انہی حضرات کی تحریک باطنی کے شواہد ظاہری ہیں، صرف حسام الدین کی عدم فرصت کی وجہ سے مثنوی شریف کی تصنیف دو برس معلق رہی۔

مولانا نے جن اصحاب کو اپنی ہم نشینی کے لیے منتخب کیا ان کے انتخاب کی وجہ کشف و کرامت نہیں تھی، آپ کا قول اور مسلک یہ تھا کہ محبت کا سبب جنسیت ہوا کرتی ہے۔ خود مولانا نے سلطان ولد کے سوال پر فرمایا کہ میں مناسبت جنسیت کی وجہ سے ان کو خاص طور پر دوست رکھتا ہوں، فرمایا کہ جو محبت مناسبت کی وجہ سے ہوتی ہے اس کا نتیجہ پشیمانی نہیں ہوتا۔ حقیقی محبت اور مناسبت سے دنیا و آخرت کہیں بھی پشیمانی نہیں ہوتی چنانچہ اہل غرض دوستوں کو آخرت میں یہ تمنا ہوگی کہ یَالَیۡتَنِیۡ لَمۡ اَتَّخِذۡ فُلَانًا خَلِیۡلًا محبان متقی کی صفت یہ ہوگی۔ اَلۡاَخِلَّآءُ

الدین محمد ص ۱۱۶۔۱۱۸) ندوی

يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ

خود فرماتے ہیں:

موجبِ ایماں نہ باشد معجزات — لیک جنسیت بود جذب صفات

مولانا کی وفات

سپہ سالار کا قول ہے کہ مولانا کے انتقال سے قبل قونیہ میں چالیس روز زلزلہ آتا رہا۔ افلاکی کا بیان ہے کہ مولانا ہنوز صاحب فراش تھے کہ سات روز برابر زلزلہ رہا۔ تمام لوگ عاجز آگئے، مولانا سے طلب امداد کی، فرمایا زمین بھوکی ہوگئی ہے، لقمۂ چرب چاہتی ہے، جلد کامیاب ہوجائے گی اور یہ زحمت تم لوگوں سے رفع ہوجائے گی اور اس زمانے میں یہ غزل ارشاد فرمائی:

با ایں ہمہ مہر و مہربانی — دل می دہدت کہ خشم رانی
ویں جملۂ شیشہ ہائے جان را — درہم شکنی بہ لن ترانی

چلپی حسام الدین کی روایت ہے کہ ایک روز شیخ صدر الدین اکابر درویشوں کے ساتھ مولانا کی عیادت کو آئے۔ مولانا کی حالت دیکھ کر رنجیدہ ہوئے اور فرمایا خدا شفائے عاجل عطا فرمائے، امید ہے کہ صحت کلی حاصل ہوجائے گی، مولانا نے فرمایا اب شفا آپ ہی کو مبارک ہو، عاشق و معشوق میں بال کا پیراہن رہ گیا ہے۔ کیا آپ نہیں چاہتے کہ وہ بھی اٹھ جائے اور نور، نور میں شامل ہو جائے۔

مرض ہی میں یہ غزل شروع کی، حسام الدین چلپی لکھتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے۔

رو سربنہ بہ بالین تنہا مرا رہا کن — ترکِ من خرابِ شب گرد مبتلا کن
مائیم و موجِ سودا شب تا بروز تنہا — خواہی بیا ببخشا خواہی برو جفا کن

از من گریز تا تو هم در بلا نیفتی — بگزیں رہِ سلامت ترک رہ بلا کن
مائیم و آبِ دیدہ در کنج غم خزیدہ — بر آب دیدہٗ ماصد جائے آسیا کن
خیرہ کشی است مارا دارد و بے چو خارا — بکشد کشش نہ گوید تدبیر خوں بہا کن
بر شاہ خوبرویان واجب وفا بنا شد — اے زرد روئے عاشق تو صبر کن وفا کن
ویست غیر مردن کا نرا دوا بنا شد — پس من چگونہ گویم کاں درد را دوا کن
در خواب دوش پیری در کوئے عشق دیدم — بادست اشارتم کرد کہ عزم سوئے ماکن

عین انتقال کے قریب فرمایا:

گر مومنی و شیریں ہم منست مرگت — در کافری و تلخی ہم کافر ست مُردن

۵ جمادی الاخریٰ ۶۷۲ھ کو بوقت غروب آفتاب حقائق و معارف بیان فرماتے ہوئے انتقال فرمایا، انتقال کے وقت مولانا کی عمر ۶۸ برس تین ماہ کی تھی۔

جنازہ کو جب باہر لائے، قیامت کا از دحام برپا ہوا۔ ہر قوم و ملت کے لوگ ساتھ تھے اور سب روتے جاتے تھے، یہودی اور عیسائی توریت و انجیل پڑھتے جاتے تھے، مسلمان ان کو ہٹاتے مگر وہ باز نہیں آتے تھے۔ فساد کا اندیشہ ہوا جب یہ خبر پروانہ[۲۷] کو پہنچی تو اس نے راہبوں اور قسیسوں سے پوچھا کہ تمہیں اس امر سے کیا تعلق ہے، انہوں نے کہا کہ ہم نے انبیائے سابقین کی حقیقت کو انہیں کے بیان سے سمجھا اور اولیائے اکمل کی روش کو انہی کی روش سے جانا۔ وہ لوگ اسی طرح تابوت کے ساتھ رہے، ہجوم کی حالت یہی رہی کہ تابوت صبح سویرے مدرسے سے روانہ ہوا تھا اور شام کے وقت قبرستان پہنچا۔ آخر بوقت شب یہ آفتاب فقر و تصوف دیدہٗ ظاہر سے نہاں ہوگیا۔

---

[۲۷] معین الدین پروانہ حاکم قونیہ

اخلاق و خصوصیات

مولانا شبلی مرحوم سوانح مولانا روم میں لکھتے ہیں:

"مولانا جب تک تصوف کے دائرہ میں نہیں آئے، آپ کی زندگی عالمانہ جاہ و جلال کی ایک شان رکھتی تھی، ان کی سواری جب نکلتی تھی تو علماء اور طلبہ بلکہ امراء کا ایک بڑا گروہ رکاب میں ہوتا تھا۔ سلاطین و امراء کے دربار سے بھی ان کو تعلق تھا لیکن سلوک میں داخل ہونے کے ساتھ یہ حالت بدل گئی۔ درس و تدریس افتاء و افادہ کا سلسلہ اب بھی جاری تھا، لیکن وہ پچھلی زندگی کی محض ایک یادگار تھی ورنہ زیادہ تر محبت و معرفت کے نشہ میں سرشار رہتے"۔

ریاضت و مجاہدہ

ریاضت و مجاہدہ حد سے بڑھا ہوا تھا۔ سپہ سالار برسوں ساتھ رہے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ میں نے کبھی ان کو شب خوابی کے لباس میں نہیں دیکھا، بچھونا اور تکیہ بالکل نہیں ہوتا تھا۔ قصداً لیٹتے نہیں تھے، نیند غالب ہوتی تو بیٹھے بیٹھے سو جاتے۔ ایک غزل میں فرماتے ہیں ؎

چہ آساید بہر پہلو کہ خسپد کسے کز خار دارد او نہالین

سماع کے جلسوں میں مریدوں پر جب نیند غالب ہوتی تو ان کے لحاظ سے دیوار سے ٹیک لگا کر زانو پر سر رکھ لیتے کہ وہ لوگ بے تکلف ہو کر سو جائیں، وہ لوگ پڑ کر سو جاتے تو خود اٹھ بیٹھتے اور ذکر و شغل میں مصروف ہوتے۔ ایک غزل میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ہمہ خفتند و من دل شدہ را خواب نبرد ہمہ شب دیدۂ من بر فلک استارہ شمرد

خوابم زدیدہ چناں رفت کہ ہرگز ناید خواب من زہر فراق تو بنوشید و بمرد

روزہ اکثر رکھتے تھے اور مسلسل کئی کئی روز کچھ نہ کھاتے تھے۔

نماز کی کیفیت

نماز کا وقت آتا تو فوراً قبلہ کی طرف مڑ جاتے اور چہرے کا رنگ بدل جاتا نماز میں نہایت استغراق ہوتا تھا، سپہ سالار کہتے ہیں کہ بارہا میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اوّل عشاء کے وقت سے نیت باندھی اور دو رکعتوں میں صبح ہوگئی، مولانا نے ایک غزل میں اپنی نماز کی کیفیت بیان کی ہے فرماتے ہیں :

چو نماز شام ہر کس نہد چراغ و خوانے	منم وخیال یارے غم و نوحہ وفغانے
چو وضو ناشک سازم بود آتشیں نمازم	در مسجدم بسوزد چو درِدر سدا ذانے
عجبا نماز مستان تو بگو درست ہست آں	کہ نداند او زمانے نہ شناند او مکانے
عجبا دو رکعت ست ایں عجبا چہارم است ایں	عجبا چہ سورہ خواندم، چو نداشتم زمانے
در حق چگونہ کوبم؟ کہ نہ دست ماندو نے دل	دل دوست چوں تو بردی بدہ اے خدا لمانے
بخدا خبر نہ دارم چو نماز می گزارم	کہ تمام شدرکوعے کہ امام شد فلانے

ایک دفعہ جاڑوں کے دن تھے، مولانا نماز میں اس قدر روئے کہ تمام چہرہ اور داڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی، جاڑے کی شدت کی وجہ سے آنسو جم کر یخ ہوگئے لیکن وہ اسی طرح نماز میں مشغول رہے۔

زہد و قناعت

مزاج میں انتہا درجہ کا زہد و قناعت تھی، تمام سلاطین و امراء نقدی اور ہر قسم کے تحائف بھیجتے تھے لیکن مولانا اپنے پاس کچھ نہیں رکھتے تھے۔ جو چیز آتی اسی طرح صلاح الدین زرکوب یا چلپی حسام الدین کے پاس بجھوا دیتے۔ کبھی کبھی ایسا اتفاق ہوتا کہ گھر میں تنگی رہتی اور مولانا کے صاحبزادہ سلطان ولد اصرار کرتے تو کچھ رکھ لیتے، جس دن گھر میں کھانے کا سامان کچھ نہ ہوتا تو بہت خوش

ہوتے اور فرماتے کہ آج ہمارے گھر میں درویشی کی بو آتی ہے۔

فیاضی و ایثار

فیاضی و ایثار کا یہ حال تھا کہ کوئی سائل سوال کرتا تو عبایا، کرتا یا جو کچھ بدن پر ہوتا اتار کر دے دیتے، اسی لحاظ سے کرتا عبا کی طرح سامنے سے کھلا ہوتا کہ اتارنے میں زحمت نہ ہو۔

بے نفسی اور فنائیت

ایک دفعہ مریدوں کے ساتھ راہ میں جا رہے تھے، ایک تنگ گلی میں ایک کتا سر راہ سو رہا تھا جس سے راستہ رک گیا تھا۔ مولانا وہیں رک گئے اور دیر تک کھڑے رہے، ادھر سے ایک شخص آرہا تھا اس نے کتے کو ہٹا دیا مولانا نہایت آزردہ ہوئے اور فرمایا کہ ناحق اس کو تکلیف دی۔

ایک دفعہ دو شخص سر راہ لڑ رہے تھے اور ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ او لعین! تو ایک کہے گا تو دس سنے گا، اتفاق سے مولانا کا ادھر گزر ہوا، آپ نے اس شخص سے فرمایا کہ بھائی جو کچھ کہنا ہے مجھ کو کہو کہ تم مجھ کو اگر ہزار کہو گے تو ایک بھی نہ سنو گے۔ دونوں مولانا کے پاؤں پر گر پڑے اور آپس میں صلح کر لی۔

کسبِ حلال

معاش کا یہ طریقہ تھا کہ اوقات کی مد سے پندرہ دینار ماہوار روزینہ مقرر تھا۔ چونکہ مولانا مفت خوری کو نہایت ناپسند کرتے تھے اس لیے اس کے معاوضہ میں فتویٰ لکھا کرتے تھے، مریدوں کو تاکید کرتے تھے کہ اگر کوئی فتویٰ

لائے تو لوگوں میں کسی حالت میں ہوں ضرور خبر کردو تاکہ یہ آمدنی مجھ پر حلال ہو۔

ایک دفعہ کسی نے کہا کہ شیخ صدرالدین کو ہزاروں روپیہ کا وظیفہ ہے اور آپ کو کل پندرہ دینار ماہوار ملتے ہیں۔ مولانا نے کہا کہ شیخ کے مصارف بھی بہت ہیں اور حق یہ ہے کہ یہ پندرہ دینار بھی انہی کو ملنے چاہئیں۔

اہل دنیا سے یکسوئی

مولانا کو بالطبع امراء وسلاطین سے نفرت تھی، صرف حسن خلق کی وجہ سے ان سے مل لیتے تھے ورنہ ان کی صحبتوں سے کوسوں دور بھاگتے تھے ایک دفعہ ایک امیر نے معذرت کی کہ اشغال سے فرصت نہیں ہوتی اس لیے کم حاضر ہوسکتا ہوں، معاف فرمایئے گا۔ فرمایا:

"معذرت کی ضرورت نہیں۔ میں آنے کی بہ نسبت نہ آنے سے زیادہ ممنون ہوتا ہوں[28]۔

مثنوی معنوی اور اس کا علمی واصلاحی مقام وپیغام

مثنوی معنوی

مولانا کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے پرجوش طبیعت پائی تھی، عشق ان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا، ظاہری علم اور عقلیات کے توغل نے اس آگ کو دبا رکھا تھا۔ شمس تبریز کی آتشین صحبت نے ان کی فطرت کو چھیڑ دیا اور تربیت و ماحول نے اس پر جو پردے ڈال دیے تھے وہ دفعتاً اٹھ گئے

---

[28] سوانح مولانا روم باختصار وخفیف تغیر

اور وہ سراپا سوز و ساز بن گئے۔

شعلہا آخر زہر مویم و دمید　　　از رگ اندیشہ ام آتش چکید[29]

اس مقام پر پہنچ کر عارف کے ہر بُن مو سے صدا آتی ہے کہ

درجہان یارب ندیم من کجاست　　　نخل سینا یم کلیم من کجاست[30]

یہی وجہ تھی کہ ہمدم و ہمراز کے بغیر ان کے لیے جینا محال تھا، شمس تبریز کے بعد جب تک ان کو صلاح الدین زرکوب اور صلاح الدین زرکوب کے بعد جب تک ان کو حسام الدین چلپی نہیں مل گئے، ان کی بے قرار طبیعت کو سکون نہیں ہوا۔

شمع را تنہا طپیدن سہل نیست

یہی آتش سوزاں تھی جو ان کو کشاں کشاں سماع کی طرف لے جاتی تھی اور وہ اس سے قوت اور غذا حاصل کرتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں:

پس غذائے عاشقان آمد سماع　　　کہ ازو باشد خیالِ اجتماع
قوتے گیرد خیالاتِ ضمیر　　　بلکہ صورت گردد از بانگِ صفیر[31]
آتشِ عشق از نواہا گرد تیز　　　آنچنانکہ آتش آں جوز ریز[32]

اسی سوز نے ان کے ساز کو چھیڑا اور خاموش رہنا ان کے لیے ناممکن کردیا۔ اس لیے ان کے بقول

۲۹　اقبال در مثنوی اسرار خودی
۳۰　نول کشور اشاعت نہم
۳۱　مثنوی ص۳۱۹ نول کشور اشاعت نہم
۳۲　مثنوی ص۳۱۹ نول کشور اشاعت نہم

جوش نطق از دل نشان دوستیست — بستگی نطق ، از بے الفتی است

دل کہ دلبر دید کے ماند ترش — بلبلِ گل دیدہ کے ماند خمش[۳۳]

اس ساز سے جو نغمے نکلے ان کے مجموعے کا نام مثنوی ہے، یہ ان کے خیالات و حالات، واردات و تاثرات اور مشاہدات و تجربات کا آئینہ ہے۔ اس میں صاحب کلام کا سوز درد "جوش و مستی" اور ایمان و یقین بھرا ہوا ہے اور یہی اس کی عالمگیر مقبولیت اور بے نظیر تاثیر کی اصل وجہ ہے

کہ ہے رگِ ساز میں رواں صاحب ساز کا لہو[۳۴]

عقلیت و ظاہر پرستی پر تنقید

مولانا کا علمی نشوونما تمام تر اشاعرہ کے علمی ماحول میں ہوا تھا۔ وہ خود ایک کامیاب مدرس اور معقول عالم تھے، توفیق الٰہی نے جب ان کو معرفت و آگہی کے مقام تک پہنچایا اور قال سے حال، خبر سے نظر، الفاظ سے معانی، اور اصطلاحات و تعریفات کے لفظی طلسم سے ترقی کر کے حقیقت و مغز تک پہنچے تو ان کو فلسفہ و علمِ کلام کی کمزوریوں اور استدلال و قیاس کی غلطیوں کا اندازہ ہوا اور فلاسفہ و متکلمین اور اہلِ استدلال کی بے بضاعتی اور حقیقت نا شناسی کی حقیقت ان پر منکشف ہو گئی تو انہوں نے بڑی قوت اور وضاحت کے ساتھ علم کلام پر تنقید کی۔ وہ چونکہ اس کوچہ کے ذرہ ذرہ سے آشنا ہیں اس لیے وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ ان کا ذاتی تجربہ و مشاہدہ ہوتا ہے اور اس کی واقعیت کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

اس عصر کی فلسفہ و عقلیات کا سب سے زیادہ زور حواس ظاہری پر تھا۔ ان حواسِ خمسہ کو علم اور حصولِ یقین کا سب سے زیادہ مستند اور قابلِ وثوق ذریعہ

۳۳ مثنوی ص ۵۵۱

۳۴ اقبال بالِ جبریل

سمجھا جاتا تھا اور جو چیز ان کی گرفت میں نہ آسکے اور ان کے ذریعہ اس کی تصدیق نہ ہوسکے، اس کی نفی اور اس کے انکار کی طرف رجحان روز بروز ترقی کررہا تھا۔ معتزلہ اس "حسیت" کے سب سے بڑے نقیب تھے، اس حواس پرستی نے ایمان بالغیب کو بہت نقصان پہنچایا تھا اور شریعت اور وحی کے پیش کئے ہوئے حقائق کی طرف سے ایک طرح کی بے اعتمادی پیدا کردی تھی، مولانا اس حواس پرستی اوراس کے پرجوش وکیلوں پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

چشم حس راہست مذہب اعتزال　　دیدۂ عقل است سنّی در وصال
سخرۂ حس اند اہل اعتزال　　خویش راسنّی نمایند از ضلال
ہر کہ در حس ماند اومعتزلی است　　گرچہ گوید سنیم از خامی است
ہر کہ بیروں شد ز حس سنّی ویست　　اہلِ بینش اہلِ عقل خویش بیست[۳۵]

انہوں نے جا بجا ثابت کیا ہے کہ ان حواس ظاہری کے علاوہ انسان کوکچھ حواسِ باطنی عطا ہوئے ہیں۔ یہ حواسِ باطنی حواسِ ظاہری کے مقابلہ میں کہیں زیادہ وسیع اور وقیع ہیں، فرماتے ہیں:

پنج حسّے ہست جز ایں پنج حس　　آں چوزرسرخ وایں حسہا چو مس
اندراں بازار کاہل محشر اند　　حِس مس راچوں حِس زر کے خرند
حِسّ ابداں قوتِ ظلمت می خورد　　حسِ جاں از آفتابے ی چرد[۳۶]

ان کے نزدیک کسی چیز کے انکار کے لیے یہ ثبوت بالکل کافی نہیں کہ وہ دیکھنے میں نہیں آتی، یا حواس اس کی تصدیق نہیں کرتے، ان کے نزدیک باطن ظاہر کے پیچھے پنہاں اور دوا میں فائدہ کی طرح اس میں پنہاں ہے، منکرین باطن کا

۳۵　مثنوی ص ۱۰۱

۳۶　مثنوی ص ۱۰۱

ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

حجتِ منکر ہمی آمد کہ من	غیر ازیں ظاہر نمی بینم وطن
ہیچ نندیشد کہ ہر جا ظاہر است	آں ز حکمت ہائے پنہاں مخبرست
فائدہ ہر ظاہرے خود باطنیت	ہمچو نفع اندر دوا ہا مضمریست[۳۷]

ان کا کہنا ہے کہ منکرین اپنی اس ظاہر بینی اور کوتاہ نظری کی عادت کی وجہ سے ان حقائق باطنی کی دید سے محجوب اور اصل غایت و مقصد سے محروم ہیں۔

چونکہ ظاہر ہا گرفتند احمقاں	آں دقائق شد از یشاں بس نہاں
لاجرم محجوب گشتند از غرض	کہ دقیقہ فوت شد در مفترض[۳۸]

حواس سے آگے بڑھ کر وہ عقل پر بھی تنقید کرتے ہیں کہ عالمِ غیب کے حقائق اور انبیاء کے علوم و معارف کے بارہ میں عقل بھی کوتاہ اور نارسا ہے۔اس کے پاس قیاس کی کوئی بنیاد نہیں اور وہ اس عالم کا کوئی تجربہ نہیں رکھتی، دریائے شور کا رہنے والا آبِ شیریں کا کیا اندازہ کر سکتا ہے؟

اے کہ اندر چشمۂ شور است جات	تو چہ دانی شطّ و جیحون و فرات[۳۹]

وہ اس عقل کو جو محسوسات اور مقدمات کی پابند ہو عقل جزوی کے نام سے یاد کرتے ہیں، ان کے نزدیک اوہام و شکوک اس کا ثمرہ، عالم ظلمات اس کا وطن ہے، وہ عقل کے لیے باعثِ بدنامی اور انسان کے لیے سبب ناکامی ہے، اس عقل جزوی سے دیوانگی اچھی!

---

۳۷ مثنوی ص ۳۶۸

۳۸ مثنوی ص ۴۲۲

۳۹ مثنوی ص ۴۲۲

عقل جزوی آفتش وہم ست و ظن ... زانکہ در ظلمات شد اورا وطن[۴۰]
عقل جزوی عقل رابد نام کرد ... کام دنیا مرد را بے کام کرد[۴۱]
زیں خرد جاہل ہمی باید شدن ... دست در دیوانگی باید زدن[۴۲]

وہ کہتے ہیں کہ میں نے خود اس عقل دور اندیش کا تجربہ کیا ہے اور اس نتیجہ تک پہنچا ہوں۔

آزمودم عقل دور اندیش را ... بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را[۴۳]

پھر وہ ایک سیدھی اور عام فہم بات کہتے ہیں کہ اگر عقل دینی حقائق و معارف کے ادراک کے لیے کافی ہوتی تو اہل منطق و استدلال اور ائمۂ کلام سب سے بڑے عارف اور دین کے محرم اسرار ہوتے۔

اندریں بحث از خردرہ بیں بُدے ... فخر رازی رازدارِ دین بُدے[۴۴]

ان کے نزدیک انسانوں کے ساختہ پرداختہ علوم، علم حقیقی کے لیے حجاب اور سالک کے لیے انتشار و اضطراب کا موجب ہیں، اس لیے یقین و معرفت کے لیے ان میں اضافہ و ترقی کی بجائے کمی اور ان سے گلو خلاصی کی ضرورت ہے:

گر تو خواہی کت شقاوت کم شود ... جہد کن تا از تو حکمت کم شود
حکمتے کز طبع آید و زخیال ... حکمتے بے فیض نور ذوالجلال

---

۴۰ مثنوی ص ۲۲۴

۴۱ مثنوی ص ۴۰۲

۴۲ مثنوی ص ۱۵۲

۴۳ مثنوی ص ۱۵۲

۴۴ مثنوی ص ۴۸۹

حکمتے دنیا فزاید ظن و شک حکمتِ دینی برد فوق فلک[۴۵]

ان کے خیال میں استدلال، مقدمات کی ترتیب اور نتیجہ کا استخراج ایک مصنوعی طریقہ ہے اور اس سے بہت محدود اور ناقص نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ اس سے دینی حقائق کا ثابت کرنا ایسا ہی مشکل ہے جیسے لکڑی کے مصنوعی پاؤں کے ذریعہ آزادانہ چلنا پھرنا اور سفر طے کرنا، ان کی یہ تمثیل ضرب المثل کا درجہ رکھتی ہے اور زبان زد خاص و عام ہے کہ:

پائے استدلالیاں چوبیں بود پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود[۴۶]

ان کے نزدیک علم کلام اور متکلمانہ بحث واستدلال سے یقین کی کیفیت اور حلاوت ایمانی حاصل نہیں ہوتی اس لیے کہ متکلم جو تقلیداً متقدمین کے دلائل و براہین کو نقل کر دیتا ہے اور آموختہ سانسا دیتا ہے خود بے روح اور ذوق و کیفیاتِ یقین سے محروم ہے۔

آں مقلد صد دلیل و صدبیان بر زبان آردندارد ہیچ جان
چونکہ گوینده ندار جان و فر گفت اورا کے بود برگ و ثمر[۴۷]

وہ اس عقل جزوی کے بجائے جو محسوسات و معلومات اور تجربات کی پابند اور دنیا کے اندر محدود ہے۔ اس عقلِ ایمانی کے قائل ہیں جو خود عقل کے لیے رہنما اور اس کے لیے چراغِ راہ ہے اور جو اس سے وہ نسبت رکھتی ہے جو عقل جزوی جسم کے ساتھ اور جس کے بغیر یہ عقل، عقل کہلانے کی مستحق نہیں

---

۴۵ مثنوی ص ۱۷۱

۴۶ مثنوی ص ۵۵

۴۷ مثنوی ص ۴۴۹

اس لیے اس کو عقلِ عقل کہہ سکتے ہیں۔ یہ عقلِ عقل ان لوگوں کا حصہ ہے جو نورِ ایمان اور دولتِ یقین سے بہرہ ور ہیں:

بند معقولات آمد فلسفی   شہسوارِ عقلِ عقل آمد صفی[۴۸]

عقل جزوی سے انسان کے دفتر سیاہ ہیں۔ عقلِ عقل سے عالم مطلعِ انوار ہے۔

عقل دفترہا کند یکسر سیاہ   عقلِ عقل آفاق دارد پُر زماہ

از سیاہی و سپیدی فارغ است   نورِ ماہش بر دل و جان[۴۹] بازغ است

عقلِ ایمانی شہر کے لیے پاسبان کا حکم رکھتی ہے۔ عقل جزوی کا تقاضا خوف و ہراس اور دنیا کے اندیشے ہیں۔ عقلِ ایمانی کا تقاضہ اطمینان اور خواہشات نفس سے حفاظت ہے۔

عقلِ ایمانی چو شحنہ عادل است   پاسبان و حاکمِ شہرِ دل است

عقل درتن حاکمِ ایمان بود   کہ زبیمش نفس در زندان بود[۵۰]

ان کے نزدیک جس طرح حواس عقل کے تابع اور محکوم ہیں اسی طرح عقل پر روح کو تفوق اور حکومت حاصل ہے۔ روح ایک اشارہ میں عقل کی سیکڑوں گرہیں کھول دیتی ہے اور چٹکیوں میں اس کی مشکل آسان کر دیتی ہے۔

حس اسیرِ عقل باشد اے فلاں   عقل اسیرِ روح باشد ہم بدان

دست بستہ عقل راجان باز کرد   کارہائے بستہ راہم ساز کرد[۵۱]

---

۴۸ مثنوی ص ۲۴۶

۴۹ مثنوی ص ۲۴۶

۵۰ مثنوی ص ۲۴۷

۵۱ مثنوی ص ۲۳۰

فلسفی ادنی معقولات اور ابتدائی معلومات کی منزل سے آگے نہیں بڑھتا، اس کی عقل نے ابھی دروازہ سے باہر قدم ہی نہیں نکالا ہے۔

فلسفی گوید ز معقولات دون　　عقل از دہلیز می ناید برون[۵۲]

فلسفی خود اپنی عقل و فکر کا مارا ہوا ہے، وہ ایسا بدقسمت مسافر ہے کہ اس کی پشت منزل کی طرف اور رخ صحرا کی طرف ہے اس لیے وہ جس قدر تیز قدم بڑھاتا ہے، منزلِ مقصود سے دور ہو جاتا ہے۔

فلسفی خود را از اندیشہ بکشت　　گو بدو کو راسوے گنج است پشت
گو بدو چنداں کہ افزوں می دود　　از مرادِ دل جدا تر می شود[۵۳]

فلسفی دنیا کے علوم سے باخبر، بڑا وسیع النظر، صدہا چیزوں سے آشنا مگر اپنے آپ سے ناآشنا ہے، حالانکہ سب سے بڑا علم خود شناسی ہے۔

صد ہزاراں فضل دارد از علوم　　جان خود رامی نداد ایں ظلوم
داند او خاصیتِ ہر جوہرے　　در بیان جوہر خود چون خرے
قیمت ہر کاری دانی کہ چیست　　قیمتِ خود را ندانی زاحمقیست
جانِ جملہ علمہا این ست این　　کہ بدانی من کیم در یومِ دین[۵۴]

وہ اپنے زمانہ کے عالم و متکلم کو حکمت یونانی سے حکمتِ ایمانی کی طرف ہجرت کی دعوت دیتے ہیں۔ جو حقیقی علم اور حکمت ہے۔

چند چند از حکمت یونانیاں　　حکمت ایمانیاں راہم بخواں[۵۵]

۵۲　مثنوی ص ۲۸

۵۳　مثنوی ص ۵۴۴

۵۴　مثنوی ص ۴۴۹

۵۵　مثنوی ص ۶۸

وہ کہتے ہیں کہ تزکیۂ نفس سے صحیح معرفت نفس حاصل ہو گی۔ لوحِ دل جتنی صاف ہو گی۔ حکمت ایمانی کے نقوش اتنے ہی روشن اور اجاگر ہوں گے۔ اس وقت بغیر کتاب و استاد کے انبیاء علیہم السلام کے علوم و معارف وارد ہوں گے اور حکمت کے دہانے کھل جائیں گے۔

خویش را صافی کن زاوصافِ خود　　تا بہ بینی ذات پاک وصافِ خود
بینی اندر دل علوم انبیاء　　بے کتاب و بے معید واوستا[56]

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

آئینہ دل چون شود صافی و پاک　　نقشہا بینی برون از آب و خاک
روزنِ دل گر کشادست و صفا　　می رسد بے واسطہ نورِ خدا[57]

دعوتِ عشق

ساتویں صدی میں علم کلام او عقلیت کی جو سرد ہوا عالم اسلام میں مشرق سے مغرب تک چلی تھی اس سے دل کی انگیٹھیاں سرد ہو گئی تھیں۔ اگر کہیں عشق کی چنگاریاں تھیں تو راکھ کے ڈھیر کے نیچے دبی ہوئی تھیں ورنہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک افسردہ دلی بلکہ مردہ دلی چھائی ہوئی تھی اور کہنے والا دیر سے کہہ رہا تھا کہ

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے　　مسلمان نہیں خاک کا ڈھیر ہے

اس سرد اور خواب آور فضا میں مولانا نے "عشق" کی صدا بلند کی اور اس زور سے بلند کی کہ ایک بار عالم اسلام کے جسم میں بجلی سی کوند گئی۔

۵۶　مثنوی ص ۶۸

۵۷　مثنوی ص ۱۳۴

مولانا نے کھل کر عشق کی دعوت دی اور محبت کی کرامت اور عشق کی کرشمہ سازیاں بیان کیں۔

از محبت تلخہا شیریں شود — وز محبت مسہا زریں شود

از محبت دردہا صافی شود — وز محبت دردہا شافی شود

از محبت سجن گلشن می شود — بے محبت روضہ گلخن می شود

از محبت سنگِ روغن می شود — بے محبت موم آہن می شود

از محبت سقم صحت می شود — وز محبت قہر رحمت می شود

از محبت مردہ زندہ می شود — وز محبت شاہ بندہ می شود[۵۸]

وہ عشق کی طاقتور نعمت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

جسم خاک از عشق بر افلاک شد — کوہ در رقص آمد و چالاک شد

عشق جانِ طور آمد عاشقا — طور مست و خرَّ مُوسٰی صعقا[۵۹]

وہ فرماتے ہیں۔ عشق نہایت غیور خود دار ہے، وہ ہفت اقلیم کی سلطنت کو خاطر میں نہیں لاتا۔ جس نے ایک بار اس کا مزہ چکھ لیا اس نے پھر کسی کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔

دو عالم سے بیگانہ کرتی ہے دل کو — عجب چیز ہے لذت آشنائی[۶۰]

وہ دو عالم سے بیگانہ اور دنیا کا سب سے بڑا مست و دیوانہ ہے۔

---

۵۸ مثنوی ص ۱۳۴

۵۹ مثنوی ص ۵

۶۰ اقبال (بالِ جبریل)

بادو عالم عشق را بیگانگی اندرو ہفتاد دو دیوانگی[61]

وہ شاہوں کا شاہ اور مطلوبوں کا مطلوب ہے۔ بادشاہوں کے تخت و تاج اس کے قدموں کے نیچے ہیں۔

سخت پنہاں است و پیدا حیرتش جاں سلطانانِ جاں در حسرتش
غیر ہفتاد و ملت کیشِ او تخت شاہاں تختہ بندے پیشِ او[62]

اس فقر جسور اور عشق غیور کا جب وہ تذکرہ کرنے لگتے ہیں تو خود ان پر جوش و سرمستی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ بیخود ہو کر کہنے لگتے ہیں۔

ملکِ دنیا تن پرستان را حلال ما غلامِ ملکِ عشقِ بے زوال[63]

وہ کہتے ہیں کہ عشق کی ہی وہ بیماری ہے جس سے بیمار کبھی شفا نہیں چاہتا بلکہ اس میں اضافہ و ترقی ہی کی دعا کرتا ہے۔

جملہ رنجو راں شفا جو یند و این رنج افزون جو یدو در دو چنین
خوبتر زین سم ندیدم شربتے زین مرض خوشتر نباشد صحتے[64]

لیکن وہ ایسی بیماری ہے کہ پھر کوئی بیماری نہیں ہوتی۔

آں کلامت می رہاند از کلام وان سقامت می جہاند از سقام[65]

بیماری بھی ایسی بیماری ہے کہ ہزار صحتیں اس پر قربان، اس کی کلفت ایسی

---

61 اقبال (بال جبریل) ۲۴۷

62 مثنوی ص ۲۴۷

63 مثنوی ص ۵۹۱

64 مثنوی ص ۵۹۵

65 مثنوی ص ۵۹۵

کلفت ہے کہ ہزاروں راحتیں اس پر نثار۔

پس مقامِ عشق جانِ صحت است　　رنجہا یش حسرتِ ہزار راحت است[66]

یہ عشق پاکباز اگر گناہ ہے تو ایسا گناہ ہے کہ طاعتیں اس کے سامنے ہیچ ہیں، اس سے ایک گھڑی میں جو ترقی حاصل ہوتی ہے وہ سالہا سال کی ریاضت سے میسر نہیں۔

زین گنہ بہتر نباشد طاعتے　　سالہا نسبت بدین دم ساعتے[67]

راہِ عشق میں جو خون بہے وہ کسی پانی سے کم پاک نہیں، شہید عشق کو ہمارے غسل و وضو کی ضرورت نہیں۔

خونِ شہید ان رازآب اولیٰ تراست　　این خطا از صد صواب اولیٰ تراست[68]

عاشق وہ جگر سوختہ و دل باختہ ہیں کہ ان پر عام انسانوں کے قوانین جاری نہیں کیے جاسکتے، جو گاؤں سراسر ویران ہوگیا ہو اس پر خراج کیسا؟

عاشقان را ہر نفس سوزید نیست　　بردہ ویران را خراج و عشر نیست[69]

عشق آدمؑ کی میراث اور زیر کی و چالاکی شیطان کا سرمایہ ہے۔

داند آں کو نیک بخت و محرم است　　زیر کی زابلیس وعشق از آدم است[70]

زیر کی و چالاکی میں اپنے دست و بازو (عقل و خرد) پر اعتماد ہوتا ہے،

---

[66] مثنوی ص ۵۹۵

[67] مثنوی ص ۱۳۹

[68] مثنوی ص ۱۳۹

[69] مثنوی ص ۱۳۹

[70] مثنوی ص ۳۳۴

عشق میں کسی کے دامن سے وابستگی ہوتی ہے اور سپردگی۔ زیرکی و چالاکی، شناوری، (پیراکی کا فن ہے)۔ "عشق" کشتی نوح، زیرک و چالاک کو اس طوفان میں بچتے اور ساحل تک پہنچتے اور صاحب عشق کو غرق ہوتے کب دیکھا گیا ہے؟

زیرکی سباحی آمد در بحار   کم زہد، غرق است او پایان کار
عشق چوں کشتی شود بہر خواص   کم بود آفت، بودا غلب خلاص[1]

عقل کی ہوشمندی عشق کی حیرانی پر قربان کردینے کے قابل ہے، وہ ہوشمندی محض ظن و قیاس ہے اور یہ حیرانی مشاہدہ و عرفان۔

زیرکی بفروش و حیرانی بجز   زیرکی ظنیست، حیرانی نظر[2]

مولانا عشق کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ محبوب بننا تو ہر ایک کے بس میں نہیں لیکن عاشق بننا ممکن ہے اگر خدا نے تم کو محبوب نہیں بنایا ہے تو تم عاشق بن کر زندگی کا لطف حاصل کرو۔

تو کہ یوسف نیستی، یعقوب باش   ہمچو او باگریہ و آشوب باش
تو کہ شیریں نیستی فرہاد باش   چوں نئی لیلیٰ تو مجنوں گرد فاش[3]

وہ ایک قدم آگے بڑھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عاشق بننے میں جو مزہ ہے اور ترقی ہے وہ محبوب بننے میں کہاں؟ اگر محبوبانِ عالم کو اس دولت سرمد کا پتہ چل جائے، محبوبوں کی صف سے نکل کر "عشاق" کی صف میں شامل ہوجائیں۔

---

[1] مثنوی ص ۳۳۴

[2] مثنوی ص ۳۳۴

[3] مثنوی ص ۴۹

ترک کن معشوق و کن عاشقی   اے گمان بردہ کہ خوب و فائقی"

لیکن "عشق" کی یہ دولت بیدار کسی مردہ و ناپائدار محبوب کے لائق نہیں، عشق خود زندہ ہے، اسے ایک زندہ و پائندہ محبوب چاہیے۔

عشق برمردہ نباشد پائیدار   عشق رابر حیٔ جان افزاے دار"

اسی زندہ و پائندہ حی و قیوم محبوب سے عشق جاوداں کی تشفی و استواری ہے، اسی سے اس کی تازگی اور آبیاری ہے۔

عشق زندہ در رواں و در بصر   ہر دمے باشد زغنچہ تازہ تر
عشق آں زندہ گزیں کو باقیست   وز شراب جانفزایت ساقیست
عشق آں بگزیں کہ جملہ انبیاء   یافتند از عشق او کارد کیا"

حسن کی اس بارگاہ عالی میں عشق کو اپنی نارسائی کا شکوہ نہیں ہونا چاہیے کہ حسن ازل سدا سے عشق نواز اور دوست طلب ہے۔

تو مگو مارا بداں شہباز نیست   باکریماں کار ہا دشوار نیست "

یہ عشق دیکھنے میں ایک بیماری ہے جو دل کی شکستگی سے پیدا ہوتی ہے، یہ بیماری بڑی جان لیوا ہے لیکن آدمی اگر اس کو برداشت کرجائے تو اس کا نتیجہ معرفت حقیقی اور حیاتِ ابدی ہے۔

---

۷۳ مثنوی ص ۴۶۶

۷۵ مثنوی ص ۴۶۸

۷۶ مثنوی ص ۱۰

۷۷ مثنوی ص ۱۰

عاشقی پیداست از زاریٔ دل   نیست بیماری چوں بیماریٔ دل
علت عاشق زعلتہا جدا ست   عشق اصطرلاب اسرارِ خداست[۷۸]

یہ بیماری سب بیماریوں کی دوا اور ہر قسم کے نفسانی و اخلاقی امراض کے لیے شفا ہے۔ جن روحانی امراض کے علاج سے طبیب مایوس اور معالج و مصلح دست بردار ہوچکے ہوں اور کوئی تدبیر کارگر نہ ہوتی ہو، عشق ایک نگاہ میں اس کو اچھا کرسکتا ہے۔ برسوں کا مریض جب عشق کے ہاتھوں اپنے روحانی امراضِ کہنہ سے شفا پاتا ہے تو سرور و بیخودی کے عالم میں پکار اٹھتا ہے۔

شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما   اے طبیب جملہ علتہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموسِ ما   اے تو افلاطون و جالینوسِ ما[۷۹]

عشق ایک شعلہ ہے جو خس و خاشاک کردیتا ہے اور محبوب کے سوا کسی کا روا دار نہیں وہ بڑا موحد، بڑا غیور ہے۔

عشق آں شعلہ است کو چوں بر فروخت   ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت
تیغ لادر قتل غیر حق براند   در نگرزاں پس کہ بعد از لاچہ ماند
ماند الّا اللہ باقی جملہ رفت   شاد باش اے عشق شرکت سوز رفت[۸۰]

یہ عشقِ الٰہی ایک بحر ناپیدا کنار ہے، اس کی داستان ختم ہونے والی نہیں، زمانہ کی وسعت بھی اس کے لیے تنگ اور دنیا کی عمر بھی اس کی داستان سرائی کے لیے کوتاہ ہے، یہ اس حسن ازلی کا قصہ ہے جس کا نہ اوّل ہے نہ آخر، اس لیے

---

۷۸ مثنوی ص ۷
۷۹ مثنوی ص ۵
۸۰ مثنوی ص ۴۰۵

یہاں خاموشی ہی بہتر اور اعترافِ عجز ہی مناسب ہے۔

شرحِ عشق ار من بگویم بردوام — صد قیامت بگزرد واں ناتمام
زانکہ تاریخِ قیامت راحد است — حد کجا آنجا کہ وصفِ ایزد است [81]

جہانِ دل

لیکن یہ عشق جس کی دعوت مولانا اس جوش و خروش سے دیتے ہیں، دل کی زندگی اور بیداری اور دل کی گرمی کے بغیر ممکن نہیں، ہر زمانہ کی طرح مولانا کے زمانہ میں بھی دل کی طاقتوں اور وسعتوں سے غفلت اور ناواقفیت بڑھتی جارہی تھی اور دماغ کی عظمت کا سکہ دلوں پر بیٹھتا جارہا تھا، دماغ روشن اور دل سرد ہوتے جارہے تھے۔ معدہ زندگی میں مرکزی مقام حاصل کرتا جارہا تھا۔ مولانا نے دل کی عظمت و وسعت کی طرف متوجہ کیا اوراس کے عجائبات و فتوحات بیان کئے اور یاد دلایا کہ انسان اپنے اس جسم خاکی میں کیسا سدا بہار باغ رکھتا ہے اور اس کے پہلو میں کیسی دنیا آباد ہے جس میں ملک کے ملک گم ہوجائیں، جس کو کسی دشمن کا خطرہ اور کسی رہزن کا اندیشہ نہیں۔

ایمن آباد است دل اے مرد ماں — حصن محکم موضعِ امن و امان
گلشن خرم بکام دوستان — چشمہا و گلستان در گلستان [82]

انہوں نے بتلایا کہ دنیا کے باغات چند دنوں کے مہمان لیکن نخلِ دل سدا جوان اور باغِ دل بہار بے خزاں ہے۔ جسم کا باغ برسوں میں لگتا ہے اور دم میں اجڑ جاتا ہے، دلوں کے باغ لگنے میں دیر نہیں لگتی مگر اس کی رعنائی اور تازگی

---

[81] مثنوی ص ۴۴۲

[82] مثنوی ص ۱۹۹

میں کبھی فرق نہیں آتا۔

گلشنے کز نقل روید یکدم است ‏ ‏ ‏ گلشنے کز عقل روید خرم است

گلشنے کز تن دمد گردد تباہ ‏ ‏ ‏ گلشنے کز دل دمد وافرحتاہ [۸۳]

وہ تلقین کرتے ہیں کہ جسم کو جوان بنانے کی سعی لاحاصل اور سکندر کی طرح "چشمۂ حیوان" کی ناکام تلاش کے بجائے عشق کے آبِ حیات کا ایک جرعہ نوشِ جان اور دل کی زندگی کا سامان کرنے کی ضرورت ہے تاکہ صحیح معنوں میں زندہ دلی اور نشاط روح حاصل ہو اور ہر دورِ زندگی میں توانائی اور رعنائی محسوس ہو۔

دل بجز تا دائما باشی جوان ‏ ‏ ‏ از تجلی چہرہ ات چوں ارغوان

طالبِ دل شو کہ تا باشی چو مل ‏ ‏ ‏ تاشوی شادان و خنداں ہمچوگل [۸۴]

لیکن دل کے لفظ سے دھوکہ نہ ہو! دل وہ نہیں ہے جو سینہ میں دھڑکتا ہے اور خواہشاتِ نفس اور بوالہوسی کی آماجگاہ ہے، جو محبت کی لذت سے نا آشنا، یقین کی دولت سے محروم، ذوق وشوق سے خالی ہے، جس کی کلی کبھی کھلتی نہیں اور جس کی قسمت کبھی چمکتی نہیں یہ دل دل نہیں، پتھر کی ایک سل ہے۔

تنگ و تاریک است چون جان بہود ‏ ‏ ‏ مینوا از ذوق سلطانِ ودود

نے دراں دل تابِ نورِ آفتاب ‏ ‏ ‏ نے کشاد عرصۂ نے فتح یاب [۸۵]

یہ دل اپنی ساخت اور اپنی صورت، شکل، جسامت کے لحاظ سے ویسا ہی ایک دل ہے جیسے اہل دل کا بیدار و بیتاب دل لیکن حقیقت کے لحاظ سے دیکھئے تو سوائے لفظی اشتراک اور جسمانی مشابہت کے دونوں میں کوئی مناسبت نہیں۔ وہ بھی

---

[۸۳] مثنوی ص ۵۹۶

[۸۴] مثنوی ص ۱۵۴

[۸۵] مثنوی ص ۱۷۰

پانی ہے جو چشمۂ صافی میں رواں ہے اور وہ بھی پانی ہے جو کسی دلدل یا کیچڑ کے اندر ہے لیکن پہلا پانی خالص پانی ہے جس سے پیاس بھی بجھائی جاسکتی ہے اور ہاتھ بھی صاف ہوسکتے ہیں دوسرے پانی میں مٹی کا اتنا جز ہے کہ اس سے پانی کا کام لینا مشکل ہے۔ یہی فرق دل اور دل میں ہے ایک دل مادہ پرست اور بوالہوس، ایک بے حس مردہ دل انسان کا ہے، ایک دل انبیاء و اولیاء کا ہے جس کی بلندی کے سامنے آسمان بھی پست اور جس کی وسعت کے آگے سارے عالم کی وسعت گرد ہے اس لیے سوچ سمجھ کر کہو کہ ہمارے پہلو میں بھی دل ہے۔

توہمی گوئی مرا دل نیز ہست	دل فرازِ عرش! شد نہ بہ پست
درِ گل تیرہ یقین ہم آب ہست	لیک ازاں آبت نباید آبد ست
زانکہ گر آب است مغلوب گِل است	پس دل خود رامگو کاین ہم دل است
آں دلے کز آسمانہا برتر است	آں دل ابدال یا پیغمبر است[86]

لیکن پھر تسلی دیتے ہیں کہ دل بہرحال دل ہے اور خدا کے یہاں کوئی دل مردود نہیں، وہ ہر دل کا خریدار ہے، اس لیے کہ خریداری سے اس کو کوئی فائدہ مقصود نہیں۔

کالۂ کہ ہیچ خلقش ننگرید	از خلافت آں کریم آں را خرید
ہیچ قلبے پیش اُو مردود نیست	زانکہ قصدش از خریدن سود نیست[87]

پھر وہ فرماتے ہیں کہ معدہ کے قفس زرین کو چھوڑ کر دل کی آزاد بستی کی سیر کرو اور خدا کی قدرت کا تماشا دیکھو، تمہارے اور خالق کے درمیان بڑا حجاب یہی معدہ اور شکم پرستی ہے۔ تم اس حجاب سے نکلے کہ تم کواس بارگاہِ عالی سے سلام پہنچے۔

---

[86] مثنوی ص ۲۳۹

[87] مثنوی ص ۵۲۱

معدہ راہگذار سوئے دل خرام   تا کہ بے پردہ زحق آید سلام[۸۸]

مقامِ انسانیت

مستبد شخصی سلطنتوں کے اثرات اور پیہم مظالم، مسلسل جنگوں کے نتیجہ میں عام انسانوں میں زندگی سے بیزاری، اپنے مستقبل سے مایوسی اور احساس کہتری پیدا ہوگیا تھا اور انسان خود اپنی نگاہ میں ذلیل ہوگیا تھا۔ عجمی تصوف نے فنائیت، انکار ذات اور خود شکنی کی تلقین اتنے جوش اور قوت سے کی تھی کہ خود نگری اور خود شناسی جس پر حرکت، جدوجہد اور کشمکش موقوف ہے، ایک اخلاقی جرم اور مانع ترقی سمجھی جانے لگی تھی۔ انسان کے سامنے ملکوتی صفات کے حصول اور لوازم بشریت سے انسلاخ، تجرد و تفرید کی تبلیغ اس انداز میں ہوئی تھی کہ انسان کو اپنی انسانیت سے شرم آنے لگی تھی اور وہ اپنی ترقی انسانیت میں نہیں بلکہ ترک انسانیت میں سمجھنے لگا تھا۔ عام طور پر مقامِ انسانیت سے غفلت اور انسان کی رفعت و شرافت سے ذہول پیدا ہوگیا تھا اور اس وقت کی ادبیات اور شعروشاعری میں تحقیر انسانیت کی روح سرایت کرگئی تھی۔ اس کا نفسیاتی اثر یہ تھا کہ لوگوں میں عام طور پر اپنے بارے میں بے اعتمادی، ناامیدی، افسردگی اور شکستہ دلی پائی جاتی تھی اور انسان کبھی کبھی حیوانات اور جمادات پر رشک کرنے لگتا تھا۔ وہ جوہر انسانیت سے ناواقف اور اپنی عظمتوں اور ترقیات سے غافل تھا۔ مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں اس پہلو کو ابھارا اور انسان کی بلندی کا ترانہ اس جوش سے بلند کیا کہ اس کی سوئی ہوئی خودی بیدار ہوگئی اور وہ اپنے مقام سے آگاہ ہوگیا۔ مولانا کی اس رجز خوانی کا پوری اسلامی

---

[۸۸] مثنوی ص ۴۵۰

ادبیات پر اثر پڑا اور اس نے شعروشاعری اور تصوف میں ایک نیا رجحان پیدا کر دیا۔

مولانا انسان کو اپنی انسانی خلقت کی طرف توجہ دلاتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جا بجا "اَحْسَنِ تَقْوِیْم" کے خطاب سے یاد فرمایا ہے یہ لباس موزوں خاص طور پر اس کے لیے قطع کیا گیا ہے اوراس کی قامت پر راست آتا ہے۔

"احسن التقویم در والتین" بخواں   کہ گرامی گوہر است اے دوست جاں
"احسن التقویم" از فکرت بروں   "احسن التقویم" از عرشش فزوں[89]

وہ فرماتے ہیں کہ انسان کے سوا اور کس کے سر پر "کرامت" کا تاج رکھا گیا ہے اور "کَرَّمْنَا" اور "اَعْطَیْنَاکَ" کے خطاب سے مشرف کیا گیا ہے؟!

ہیچ کرّمنا شنید ایں آسمان   کہ شنید آدمی پُر غمان[90]
تاجِ کرّمنا بر فرقِ سرت   طوقِ اَعطیناک آویز برت[91]

وہ فرماتے ہیں کہ انسان خلاصۂ کائنات اور مجموعۂ اوصافِ عالم ہے، انسان کیا ہے، ایک کوزہ میں دریا بند ہے اور ایک مختصر سے وجود میں پورا عالم پنہاں ہے۔

---

[89] مثنوی ص ۵۱۵

[90] مثنوی ص ۴۹۵

[91] مثنوی ص ۴۷۵

آفتابے در یکے ذرہ نہاں　　ناگہاں آں ذرہ بکشاید دہان
ذرہ ذرہ گردد افلاک و زمین　　پیش آں خورشید چوں جست از کمین[۹۲]
بحر علمے در نمی پنہاں شدہ　　در سہ گز تن عالمے پنہان شدہ[۹۳]

انسان آفرینش عالم کا مقصود اور تمام کائنات کا محسود ہے۔ اسی سے اس عالم کا رنگ و بو اور زندگی کی آبرو ہے۔ اس کی طاعت تمام موجودات پر فرض ہے۔

ہر شرابے بندہ آں قدوخد　　جملہ مستان رابود بر توحسد
ہیچ محتاج مئے گلگون نئے　　ترک کن گلگو نہ تو گلگوئے
جوہر است انسان و چرغ اور اعرض　　جملہ فرع و سایہ اندو تو غرض
علم جوئی از کتب ہائے فسوس　　ذوق جوش توز حلوائے سبوس
خدمتت بر جملہ ہستی مفترض　　جوہرے چون عجز دارد با عرض[۹۴]

یہی نہیں بلکہ انسان مظہر صفاتِ الٰہی ہے۔ وہی ایک ایسا آئینہ ہے جس میں تجلیات و آیات کا عکس نظر آتا ہے۔

آدم اصطرلاب اوصافِ علوست　　وصفِ آدم مظہر آیات اوست
ہرچہ دورے می نماید عکسِ اوست　　ہمچو عکس ماہ اندر آبجوست
خلق را چوں آب دان صاف و زلال　　وندرو تابان صفات ذوالجلال
علم شان و عدل شان و لطف شان　　چوں ستارہ چرخ در آب رواں[۹۵]

اس سب کے فرمانے کے بعد وہ محسوس کرتے ہیں کہ انسان کی تعریف

۹۲　مثنوی ص ۵۹۴
۹۳　مثنوی ص ۴۷۵
۹۴　مثنوی ص ۴۷۵
۹۵　مثنوی ص ۵۶۲

اوراس کی قدر و قیمت کا بیان اب بھی مکمل نہیں اور سچ پوچھیے تو کسی میں اس کے سننے کی تاب بھی نہیں۔

گر بگویم قیمت آں ممتنع　　من بسوزم، ہم بسوزد مستمع"

اس رفعت و بلندی کے بعد خدا کے سوا انسان کا کوئی خریدار ہو سکتا ہے اور کون اس کی قیمت لگا سکتا ہے۔حیف ہے کہ انسان خود اپنی قیمت نہ جانے اور ہر قیمت پر ہر ایک کے ہاتھ بک جانے کے لیے تیار ہو وہ بڑی دل سوزی سے فرماتے ہیں۔

اے غلامت عقل و تدبیرات و ہوش　　تو چرائی خویش را ارزاں فروش"

پھر فرماتے ہیں کہ انسان کا سودا ہو چکا ہے، اللہ اس کا خریدار ہے اور وہی انسان کا سچا قدر دان ہے۔

مشتریٔ ماست اللہ اشتریٰ　　از غم ہر مشتری ہین برتر آ

مشتریٔ جو کہ جویانِ تو است　　عالم آغاز و پایانِ تو است"

لیکن یہ سب ان انسانوں کا تذکرہ ہے جو جوہر انسانیت سے آراستہ اور حقیقت انسانیت سے آشنا ہیں۔ ان انسان نما آدمیوں کا ذکر نہیں جو انسانیت کا خول اور صورت ہی صورت ہیں، جو اپنے نفس کے مارے ہوئے اور خواہشات نفس کے قتیل ہیں۔یہ آدمی نہیں ہیں آدمی کی بے جان تصویریں ہیں۔

ایں نہ مرد اند ایںہا صورت اند　　مردۂ نان اند و کشتہ شہوت اند"

۴۶　مثنوی ص ۵۱۵

۴۷　مثنوی ص ۴۷۵

۴۸　مثنوی ص ۴۲۶

۴۹　مثنوی ص ۴۵۹

ہر زمانہ کی طرح مولانا کے زمانہ میں بھی یہ حقیقی انسان کمیاب اور عنقا صفت تھا۔ عام طور سے وہی انسان ملتے تھے جو چوپایوں اور درندوں کے اخلاق رکھتے تھے۔ مولانا ان بہائم صفت اور درندہ خصلت انسانوں سے اکتا گئے تھے اور ان کو "انسان" کی تلاش تھی، اپنی تلاش تھی، اپنی تلاش کا واقعہ ایک دلچسپ مکالمہ کی شکل میں بیان فرماتے ہیں۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر | کز دام ودو ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہانِ سُست عناصر دلم گرفت | شیر خدا و رستم و ستانم آرزو ست
گفتم کہ یافت می نہ شود جستہ ایم ما | گفت آن کہ یافت ی نشود آنم آرزوست[100]

دعوتِ عمل

مولانا کا تصوف اور ان کی تلقین ، تعطل، بے عملی اور رہبانیت کی مبلغ نہیں۔ وہ عمل، جدوجہد، کسب اور اجتماعی زندگی کے داعی اور مبلغ ہیں، رہبانیت اور ترکِ دنیا کو اسلام کی روح کے منافی ور تعلیماتِ نبوت کا مخالف سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اگر اجتماعی زندگی مطلوب نہ ہوتی تو جمعہ و جماعت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تاکید کیوں ہوتی فرماتے ہیں۔

مرغ گفتش خواجہ در خلوت مایست | دین احمدؐ را ترہب نیک نیست
از ترہب نہی فرمود آں رسولؐ | بدعتے چوں در گرفتی اے فضول
جمعہ شرط است و جماعت در نماز | امر معروف وز منکر احتراز
درمیانِ امت مرحوم باش | سنتِ احمدؐ مہل محکوم باش[101]

---

[100] دیوان

[101] دیوان ص ۵۰۳

ان کے زمانہ میں توکل تعطل محض کا مرادف بن کر رہ گیا تھا۔ کسی قسم کی احتیاط و انتظام کو توکل کے منافی سمجھا جاتا تھا اور بری نظر سے دیکھا جاتا تھا مولانا نے توکل کا شرعی مفہوم بیان کیا اور کسب کی ترغیب دی اور اس کی فضیلت بیان کی "اعقلها وتوکل علی الله[102]" کا مضمون حدیث بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

گفت پیغمبر بآواز بلند — با توکل زانوئے اشتر بہ بند
رمز الکاسب حبیب اللہ شنو — از توکل درکسب کاہل مشو
رو توکل کن تو باکسب اے عمو — جہد می کن، کسب می کن موبمو
جہد کن جدے نماتا وارہی — در تو از جہدش بمانی ابلہی[103]

انہوں نے کمزور جانوروں کی زبان سے توکل و تعطل کے وہ تمام دلائل نقل کردیے ہیں جو عام طور پر ضعیف الہمت اشخاص پیش کیا کرتے ہیں۔ یہ دلائل بڑے معقول اور وزنی معلوم ہوتے ہیں۔ پھر ان کا تفصیل سے جواب دیا ہے۔ شیر کا جواب مولانا کے اصل خیالات کا آئینہ ہے۔

شیر کی زبان سے وہ فرماتے ہیں کہ انسانوں کو جو اعضا و جوارح اور جو صلاحیتیں اور طاقتیں دی گئی ہیں ان سے خود ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے کوشش اور جدوجہد مطلوب ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے غلام کے ہاتھ میں کدال یا پھاوڑا دے دے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس سے وہ زمین کھودے یا چٹان توڑے، اس کے لیے زبان سے کہنے کی کچھ ضرورت نہیں۔ اسی طرح جب ہم کو ہاتھ پاؤں اور کام کرنے کی قدرت دی گئی ہے تو اس کا مقصد یہی ہوسکتا ہے کہ ہم اپنے ہاتھ

---

102. اونٹنی باندھ دو پھر اللہ پر توکل کرو

103. دیوان ص ۳۶

پاؤں اور جسمانی قوت سے کام لیں اور اپنے ارادہ و اختیار کو عمل میں لائیں۔ اس بنا پر سعی و عمل اور کسب و جہد عین خدا کی مرضی اور فطرت کا اشارہ ہے اور تعطل اور ترکِ عمل منشائے الٰہی کے خلاف اور کفرانِ نعمت ہے۔ صحیح توکل یہ ہے کہ کوشش میں کمی نہ کی جائے اور نتیجہ کے بارے میں خدا پر بھروسہ کیا جائے کیونکہ کامیابی خدا کے ہاتھ میں ہے۔ فرماتے ہیں۔

گفت شیر آری ولے ربّ العباد ۔۔۔ نرد بانے پیش پائے ما نہاد
پایہ پایہ رفت باید سوئے بام ۔۔۔ ہست جبری بودن اینجا طمع خام
پائے داری چوں کنی خود را تو لنگ ۔۔۔ دست داری چوں کنی پنہاں توچنگ
خواجہ چوں بیلے بدست بندہ داد ۔۔۔ بے زبان معلوم شد اور امراد
چوں اشارتہاش رابر جان نہی ۔۔۔ در وفائے آں اشارت جان دہی
پس اشارت ہاش اسرارت دہد ۔۔۔ بار بردار وزتو کارت دہد
سعی شکر نعمت قدرت بود ۔۔۔ جبر تو انکار آں نعمت بود
شکر نعمت نعمتت افزون کند ۔۔۔ کفر نعمت از کفت بیرون کند
ہاں مخسپ اے جبری بے اعتبار ۔۔۔ جز بزیر آں درخت میوہ دار
تا کہ شاخ افشاں کند ہر لحظہ باد ۔۔۔ بر سر خفتہ بریزد نقل و زاد
گر توکل می کنی در کار کن ۔۔۔ کسب کن پس تکیہ برجبار کن[۱۰۳]

پھر شیر کی زبان سے وہ اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ جدوجہد اور سعی و عمل سنت انبیاء اور طریق اولیا ہے۔ پھر وہ یہ نکتہ بیان کرتے ہیں کہ مال و اولاد دنیا نہیں ہے جس کی شریعت میں مذمت ہے اور جو خدا کی رحمت سے دور ہے وہ غفلت کی زندگی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

شیر گفت آرے و لیکن ہم ببیں ۔۔۔ جہد ہائے انبیاء و مرسلین

---

[۱۰۳] دیوان ص ۲۷

حق تعالیٰ جہد شان را راست کرد	انچہ دیدند از جفا و گرم و سرد
جہد می کن تا توانی اے کیا	در طریق انبیاء و اولیاء
چیست دنیا از خدا غافل بُدن	نے قماش و نقرہ فرزند و زن
مال راگر بہر دین باشی حمول	نعم مالٌ صالح گفت آں رسولؐ
جہد حق است و دوا حق است و درد	منکر اندر نفی جہدش جہد کرد[105]

وہ صرف اپنے زمانہ کے عوام ہی پر تنقید نہیں کرتے اور صرف ان غلطیوں ہی پر نہیں ٹوکتے جن کا تعلق علمی اور دینی حلقوں سے تھا بلکہ وہ پوری جرأت کے ساتھ اس طبقہ پر بھی تنقید کرتے ہیں جن کے ہاتھ میں زمامِ حکومت تھی وہ برملا اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ حکومت نااہلوں کے ہاتھ میں آگئی ہے اور بازیچۂ اطفال بن گئی ہے۔ مطلق العنان شخصی سلطنت کے زمانہ میں یہ تنقید بڑے خطرناک نتائج پیدا کرسکتی ہے مگر مولانا کی حق گو زبان خاموش نہیں رہتی، وہ فرماتے ہیں:

حکم چوں بردست رنداں اوفتاد	لاجرم ذوالنون بزندان اُوفتاد
چوں قلم در دست غدارے بود	لاجرم منصور بردارے بود
چوں سفیہاں را بود کار و کیا	لازم آمد یقتلون الانبیاء[106]

حکومت کے غلط ہاتھوں میں ہونے کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے اپنے زمانہ کی شکایت فرماتے ہیں:

---

[105] دیوان ص ۴۸

[106] دیوان ص ۱۳۱

حکم چوں در دستِ گمراہے بود　　جاہ پندارید و در چاہے فتاد
احمقاں سر درشد ستند وزبیم　　عاقلاں سرہا کشیدہ در گلیم[۱۰۷]

عقائد و علمِ کلام

مولانا نے عقلیات و حسیات پر صرف تنقید اور اپنے زمانہ کے علم کلام کی بے اعتدالی، ظاہر پرستی اور لفظی معرکہ آرائی پر گرفت ہی نہیں کی اور صرف باطنی احساسات، وجدان اور روح سے کام لینے اور عشق کی دعوت دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ کلامی مسائل و مشکلات کو اپنے مخصوص انداز سے حل کرنے اور اپنے مخصوص پیرایہ میں بیان کرنے اور دل نشین کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ گویا مولانا کی دعوت اور ان کا فلسفہ صرف سلبی اور ناقدانہ ہی نہیں ہے بلکہ ایجابی اور معلمانہ بھی ہے۔ جن مسائل کے حل کرنے میں علم کلام کے بازو شل ہو کر رہ گئے ہیں اور جن گتھیوں کے سلجھانے کی کوشش میں اور بے شمار گتھیاں پڑ گئی ہیں، مولانا ان مسائل کو اس طرح بیان کر جاتے ہیں کہ گویا ان میں کوئی پیچیدگی ہی نہیں تھی اور وہ بدیہی حقائق اور روز مرہ کی زندگی کی باتیں اور واقعات ہیں۔ مولانا کا خاص طرز یہ ہے کہ وہ دماغ کو شکست دینے کی اور مخاطب کو لاجواب کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ اپنی بات کو اس کی خوشی اور رضامندی سے دل میں بٹھانے اور ذہن میں اتارنے کی کوشش کرتے ہیں اور مخاطب کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ بات پہلے سے اس کے دل میں تھی، اور مولانا نے اس کی ترجمانی کی ہے۔ اس طرز کلام کا نتیجہ یہ ہے کہ مثنوی سے دینی اصول و عقائد اور متکلمانہ مسائل و مباحث کے

---

[۱۰۷] دیوان ۳۳۵

بارے میں ایسا اذعان شرح صدر اور اطمینانِ قلب پیدا ہوتا ہے جو علم کلام کے پورے کتب خانہ سے نہیں پیدا ہوتا اس کے ساتھ ساتھ ایک ذوق و سرور بھی پیدا ہوتا ہے جو ایک صاحب یقین اور صاحب عشق ہی کے کلام سے پیدا ہوسکتا ہے۔

مولانا اگرچہ اشعری مکتب خیال کے ایک کہنہ مشق استاد اور تبحر عالم ہیں، مگر وہ اپنے ذاتی تجربہ اور موہبتِ ربّانی سے عقائد و کلام میں مجتہد کا درجہ رکھتے ہیں اور ایک نئے علم کلام کے بانی ہیں ان کی روش عام متکلمین اور علمائے عقائد سے بالکل علیحدہ ہے اور نسبتاً قرآن مجید کے طرز استدلال اور فطرتِ سلیم سے زیادہ قریب ہے۔

وجود باری

وجود باری کا مسئلہ علم کلام اور تمام مذاہب کا معرکۃ الآرا اور بنیادی مسئلہ ہے، قدیم علم کلام نے اس کے جو دلائل دیے ہیں وہ محض منطقی ہیں، ان سے اذعان اور یقین کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ زیادہ سے زیادہ آدمی لاجواب ہو کر رہ جاتا ہے۔ قران مجید کا یہ طرز ہے کہ وہ اس بارے میں انسان کی فطرتِ سلیم کو اکساتا ہے اور اس پر اظہار اعتماد کرکے اس کے سوئے ہوئے احساس کو بیدار کردیتا ہے۔ وہ پیغمبر کی زبان سے بے ساختہ کہلواتا ہے۔

اَفِی اللّٰہِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (ابراھیم: ۱۰)

بھلا اللہ کے بارے میں بھی شک ہوسکتا ہے جو آسمان و زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔

اس بیساختگی اور استعجاب سے انسان کی فطرت چونک پڑتی ہے اور وہ اپنا صحیح کام کرنے لگتی ہے۔ پھر زمین و آسمان کی پیدائش سے پیدا کرنے والے،

مصنوعات سے صانع اور آثار سے مؤثر کی طرف دفعتاً رہبری ہو جاتی ہے، سارے قرآن مجید میں یہی طرز استدلال ملے گا کہ اللہ کی نشانیاں دیکھو اور مخلوقات سے خالق اور مصنوعات سے صانع تک پہنچو، قرآن کے نزدیک خدا کی معرفت کا یہی یقینی، مختصر اور بے خطر راستہ ہے۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ (حٰم السجدہ ۵۳)

اب ہم دکھلائیں گے ان کو اپنے نمونے دنیا میں اور خود ان کی جانوں میں یہاں تک کہ کھل جائے ان پر کہ یہ ٹھیک ہے، کیا تیرا رب تھوڑا ہے ہر چیز پر گواہ ہونے کے لیے۔

مولانا نے بھی مثنوی میں یہی طرز استدلال اختیار کیا ہے۔ وہ جا بجا کائنات سے خالق کائنات کے وجود پر استدلال کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں بہت کچھ ہوتا ہوا نظر آتا ہے لیکن کرنے والا ان ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آتا مگر جو کچھ ہو رہا ہے یہ خود اس کی دلیل ہے کہ اس پردہ کے پیچھے کوئی کرنے والا ہے لیکن فعل ظاہر اور فاعل مخفی ہے۔

دست پنہاں قلم مبن خط گزار — اسپ در جولان و ناپیدا سوار

تیر پیدا بیں و ناپیدا کمان — جانہا پیدا و پنہاں جانِ جاں[108]

لیکن حرکت خود محرک کے وجود کی دلیل ہے۔ اگر کہیں ہوا کی سنسناہٹ ہے تو سمجھ لو کہ ہوا کا چلانے والا بھی ہے۔

---

[108] مثنوی ص ۳۰۵

بادرا دیدی کہ می جنبد بدان | باد جنبا نیست اینجا بادران
پس یقین در عقل ہر دانندہ ہست | ایں کہ باجنبیدہ جنبا نندہ ہست"[109]

اگر تمہیں مؤثر نظر نہیں آتا، آثار تو نظر آتے ہیں، آثار سے سمجھ لو کہ موثر ضرور ہے۔ جسم میں حرکت وزندگی روح سے ہے، روح اگرچہ نظر نہیں آتی مگر جسم کی حرکت اس کا ثبوت ہے۔

گر تو اوری نہ بینی در نظر | فہم کن آں را باظہارِ اثر
تن بجاں جنبد نمی بینی تو جان | لیک از جنبیدن تن جان بدان"[110]

موثر کے لیے اس کے آثار اور صانع کے لیے اس کے مصنوعات سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوسکتی ہے؟ آفتاب کے وجود کے لیے اس کی روشنی سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہے؟

خود نباشد آفتابے را دلیل | جزکہ نورِ آفتابِ مستطیل"[111]

پھر کائنات صرف موجود ہی نہیں ہے بلکہ منظم ، باقاعدہ اور مرتب ہے، ہر چیز اپنے چوکھٹے میں جڑی ہوئی ہے، سیاروں کی گردش کا ایک نظام ہے، آفتاب و ماہتاب کے لیے بھی اصول و ضوابط ہیں، ابروباد بھی پیل بے زنجیر نہیں کہ جدھر کو چاہیں ادھر کو چل دیں، ان کے لیے بھی تازیانہ مقرر ہے، اگر ذرا سرتابی کریں فوراً گوشمالی کی جائے۔ یہ نظام و ترتیب صاف اس بات کا ثبوت ہے کہ کائنات کے اوپر کائنات کا خالق اور مدبر ہے اور وہ حکیم و علیم بھی ہے اور کائنات اس کے اختیار و

---

[109] مثنوی ص ۳۰۵

[110] مثنوی ص ۳۰۵

[111] مثنوی ص ۳۰۵

انتظام سے کسی وقت خارج نہیں۔

گر نمی بینی تو تدبیر قدر	در عناصر، گردش و جوشش نگر
آفتاب و ماہ دو گاؤ خراس	گردمی گردند وی دارند پاس
اختران ہم خانہ خانہ می روند	مرکب ہر نحس و سعدے می شوند
ابر راہم تازیانہ آتشیں	می زند کہ ہان چنین روئے چنیں
بر فلان وادی ببار ایں سو، مبار	گوشمالش می دہد کہ گوش دار[112]

پھر وہ فرماتے ہیں کہ اس کائنات کو خالق کائنات نے اپنے فائدہ کے لیے نہیں پیدا کیا بلکہ انسان کے فائدہ اور اس کی ترقیات کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس طرح وہ خلق عالم کی مصلحت کو جس میں فلاسفہ و متکلمین سرگرداں ہیں بڑے دل نشین پیرایہ میں بیان کرتے ہیں۔ اس میں بھی ان کا البیلا پن اور سرور و مستی موجود ہے۔

گفت پیغمبر کہ حق فرمودہ ست	قصد من از خلق احسان بودہ ست
آفریدم تاز من سودے کنند	تاز شہدم دست آلودے کنند
نے برائے آں کہ من سودے کنم	در برہنہ من قبائے بر کنم[113]
من نہ کردم خلق تا سودے کنم	بلکہ تا بر بندگاں جو دے کنم

نبوت اور انبیاء

انبیاء علیہم السلام کا تعارف وہ خود ان کی زبان سے کراتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ وہ طبیبانِ الٰہی اور معالجین قلوب ہیں۔ طبیب نبض سے دل تک پہنچتے

---

[112] مثنوی ص ۵۱۳

[113] مثنوی ص ۱۵۹

ہیں انبیاء براہِ راست دل تک پہنچ جاتے ہیں۔ طبیبوں نے صحت جسمانی کے بقاء اور انبیاء نے دلوں کی شفا اور اخلاق و اعمال کی اصلاح اور اعتدال پر توجہ دی ہے۔

ماطبیبایئم شاگردانِ حق — بحر قلزم دید مارا فانفلق

آں طبیبانِ طبیعت دیگر اند — کہ بدل از نبضے بنگرند

ما بدل بیواسطہ خوش بنگریم — کز فراست مابہ اعلیٰ منظریم

آں طبیبانِ غذا نیدو ثمار — جانِ حیوانی بدیشاں استوار

آں طبیبانِ فعالیم و مقال — ملہم ما پرتوِ نور جلال

کایں چنیں فعلے ترا نافع بود — واں چناں فعلے زرہ قاطع شود

ایں چنین قولے ترا پیش آورد — واں چناں قولے ترا نیش آورد

آں چناں و ایں چنان از نیک و بد — پیش تو بینم و بنمایئم جد

آں طبیبانِ رابود بوے ولیل — ویں ولیل مابود وحی جلیل[114]

دلائل نبوت میں بھی وہ عقلی ولائل و مقدمات سے استدلال کرنے کے بجائے عموماً ذوقی اور وجدانی دلائل سے استدلال کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر کی ہرادا بتلاتی ہے کہ وہ پیغمبر ہے، وہ سرتاپا اعجاز ہوتا ہے دیکھنے والوں کے لیے (بشرطیکہ ان میں عناد اور تکبر نہ ہو) وہ خود اپنی نبوت کی دلیل ہوتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے کہ عبداللہ بن سلامؓ نے جمال جہان آراء پر نظر پڑتے ہی بے ساختہ فرمایا تھا۔

وَاللهِ هٰذا لَيْسَ بوجه كَذّاب . بخدا یہ کسی دروغ گو کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔

در دلِ ہر کس کہ دانش را مزہ است — روو آواز پیمبرؑ معجزہ است

---

[114] مثنوی ص ۲۵۰

وہ فرماتے ہیں کہ پیغمبر اور امت کے ضمیر میں ایک ایسی مناسبت ہوتی ہے کہ پیغمبر جو کچھ کہتا ہے امت کا ضمیر اس میں آمنا و صدقنا ہی پکارتا ہے۔ امت کا ضمیر پیغمبر کی ہر صدا پر وجد کرتا ہے اس لیے کہ وہ صدا ایسی دلکش، ایسی معصوم اور دنیا میں ایسی انوکھی اور نرالی ہے کہ اس میں اور کسی صدا اور دعوت میں کوئی مناسبت اور کسی اشتباہ کا موقع نہیں۔ فرماتے ہیں۔

چوں پیمبر از برون بانگے زند	جانِ امت در درون سجدہ کند
زانکہ جنس بانگِ او اندر جہان	از کسے نشنیدہ باشد گوشِ جان
آن غریب از ذوق آوازِ غریب	از زبانِ حق شنود اِنّی قریب[115]

وہ کہتے ہیں کہ سننے والوں کو پیغمبر کی صداقت کے لیے کسی خارجی دلیل کی ضرورت نہیں، ان کا کہنا دعویٰ بھی ہے اور دلیل بھی اور نظام عالم اسی پر قائم ہے پیاسے کو (بشرطیکہ سچی پیاس ہو) پانی کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ پانی کا ثبوت نہیں مانگتا، بچہ کو ماں دودھ پلانا چاہتی ہے تو وہ دلیل کا انتظار نہیں کرتا، طلب اور محبت اعتماد اور پیش قدمی کے لیے کافی ہے۔

تشنہ را چوں بگوئی تو شتاب	در قدح آب است بستاں زود آب
ہیچ گوید تشنہ کیں دعویٰ است رد	از برم اے مدعی! مہجور شو،
یا بطفل شیر مادر بانگ زد	بیا من مادرم ہاں اے ولد
طفل گوید مادرا حجت بیار	تاکہ باشیرت بگیرم من قرار[116]

ان کے نزدیک معجزہ موجبِ ایمان نہیں ہے، یعنی ضروری نہیں کہ معجزہ دیکھنے والا ایمان لے ہی آئے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ معجزہ دیکھ کر ایمان لانے والوں کے نام

---

[115] مثنوی ص ۱۸۰

[116] مثنوی ص ۱۸۰

سیرت میں مشکل سے ملیں گے، مشاہیر صحابہ وہی ہیں جو خود حضور ﷺ کو دیکھ کر ایمان لائے تھے اور اصل ایمان ان ہی کا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ معجزات تو مغلوب اور لاجواب کرنے کے لیے ہیں اور جو مغلوب و لاجواب ہوتا ہے وہ مشکل سے یارِ غار اور جان نثار بنتا ہے۔ اصل کشش اور تسخیر کی چیز جنسیت اور مناسبت ہے۔

موجبِ ایمان نبا شد معجزات — بوئے جنسیت کند جذبِ صفات
معجزات از بہر قہر دشمن است — بوئے جنسیت سوئے دل بردن است
قہر گردد، دشمن، اما دوست نے — دوست کے گردد بہ بستہ گردن[117]

انبیاء کے تذکرہ میں وہ فرماتے ہیں کہ وہ بڑے غیور اور خود دار ہوتے ہیں، ان سے استفادہ کے لیے ادب اور نیاز مندی شرط ہے وہ سلطان مزاج[118] ہیں۔ ان کا منصب یہ ہے کہ وہ فرمائیں اور دوسرے سنیں، معارضہ اور مجادلہ محرومی کا باعث اور حجاب اکبر ہے۔

گر ہزاراں طالب اندو یک ملول — از رسالت بازمی ماند رسول
ایں رسولانِ ضمیر راز گو — مستمع خواہند اسرافیل خو
نخوتے وارندو کبرے چون شہان — چاکری خواہند از اہل جہان
تا ادبہا شان بجا گہ ناوری — از رسالت شان چگونہ برخوری[119]

فرماتے ہیں کہ اور ایسا کیوں نہ ہو یہ بھی تو دیکھو کہ وہ کہاں سے آئے ہیں اور کس کا پیام لائے ہیں۔

ہر ادب شان کے ہمی آید پسند — کامد ندیشان ز ایوان بلند[120]

---

117. مثنوی ص ۵۱۹
118. شاہ طبیعت
119. مثنوی ص ۲۷۱
120. مثنوی ص ۲۷۱

معاد

مولانا کے نزدیک موت حقیقی زندگی کا پیش خیمہ اور انسان کی ترقی کا زینہ ہے۔ آبادی ویرانی کے بغیر ممکن نہیں، خزانہ جب ہی دستیاب ہوتا ہے جب زمین کھودی جاتی ہے۔ جب بنے ہوئے مکان کو ویران کیا جارہا ہو تو سمجھ لو کہ دوبارہ آباد کرنے کا سامان کیا جارہا ہے۔

شاہ جان جسم را ویران کند　　بعد ویرا نیش آباد ان کند
کرد ویران خانہ بہر گنج و زر　　وزہمان گنجش کند معمور تر[121]

اس جسم خاکی کی شکست ایک بڑی تعمیر کی علامت ہے، کلی کے چٹکنے سے سمجھ لینا چاہئے کہ پھل آنے والے ہیں۔

چون شگوفہ ریخت میوہ سر کند　　چونکہ تن بشکست جان سر بر کند[122]

وہ جواد مطلق، وہ فیاض بر حق جان جیسی دولت دے کر کیسے بالکل چھین لے گا۔ اس لیے سمجھنا چاہیے کہ وہ زار و نزار جان لے کر زندگیٔ جاوداں عطا فرمانا چاہتا ہے۔ وہ اس خاکدان سے نکال کر وہ نعمتیں عطا فرمانا چاہتا ہے جو وہم و خیال میں بھی نہیں "مالا عین رأت ولا اذن سمعت، ولا خطر علیٰ قلب بشر"۔

آں کسے راکش کہ چنیں شاہے کُشد　　سوئے تخت و بہترین جاہے کشد
نیم جان بستاند و صد جاں دہد　　انچہ دردہ ہمت نیاید آن دہد[123]

ترقی کے مدارج عالیہ کے لیے فنا اور نیستی ضروری ہے۔ کبھی کسی نے اگلی تختی

121　مثنوی ص ۲۷۱

122　مثنوی ص ۷۴

123　مثنوی ص ۱۰

دھوئے اور پرانے نقش مٹائے بغیر تختی لکھی ہے؟ کبھی مٹی نکالے بغیر زمین کے اندر سے پانی نکلا ہے؟ لکھنے لیے آدمی سادہ کاغذ اور بونے کے لیے آدمی خالی زمین ڈھونڈتا ہے۔

لوح را اول بشوید بے وقوف — آنگہے بروے نویسد او حروف
وقتِ شستن لوح را باید شناخت — کہ مر آن را دفترے خواہند ساخت
چون اساسِ خانۂ تو افگنند — اوّلین بنیاد را برمی کنند
گل بر آرند اوّل از قعر زمین — تا بآخر برکشی ماءِ معین[124]
کاغذے جوید کہ آں نبوشتہ نیست — تخم کارد موضعے کہ کشتہ نیست

نیستی ہی ہستی کا استحقاق پیدا کرتی ہے اور خالق کی رحمت کو جوش میں لاتی ہے۔

منعم ہمیشہ فقیروں ہی پر سخاوت کرتے ہیں۔

ہستی اندر نیستی بتواں نمود — مالداران بر فقیر آرند جود

تم خود اپنی حالت پر غور کرو، تم برابر ارتقا کے منازل طے کرتے آئے ہو اور ٹوٹ پھوٹ کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ تم نے ایک جامۂ ہستی اتارا، دوسرا پہنا، ایک فنا سے تم نے بقا حاصل کیا۔ اگر تم پہلی حالت پر رہتے تو تم کو یہ ترقی و کمال کہاں سے حاصل ہوتا اور تم آب و گِل میں مقید رہتے، اب آخری ترقی سے کیوں گھبراتے ہو اور تمہارا طائر روح قفسِ عنصری سے نکلتے ہوئے کیوں ڈرتا ہے۔

تو ازن روزے کہ درہست آمدی — آتشے یا خاک یا بادے بُدی
گربدان حالت ترا بودے بقا — کہ رسیدے مرترا ایں ارتقا
از مبدل ہستی، اوّل نماند — ہستیٔ دیگر بجائے اُو فشاند[125]
ایں بقاہا از فنا ہا یافتی — از فنائش رو چرا برتافتی

---

124 مثنوی ص ۱۴۱

125 مثنوی ص ۴۱۰

ایں فنا ہاچہ زیان بودت کہ تا بربقا چفیدۂ اے بے نوا[۱۲۶]

اس لیے دراصل موت، موت نہیں زندگی کی تمہید ہے اور مرنے کا دن مومن کے لیے شامِ غم نہیں صبحِ عید ہے۔

آز مودم مرگِ من در زندگی است چون اہم زیں زندگی پابند گسیت[۱۲۷]

عارفوں کی موت کو عامیوں کی موت پر قیاس نہیں کرنا چاہئے۔ ان کو اس جہانِ فانی سے چھوٹنے کا غم نہیں ہوتا۔ موت ان کے لیے مژدۂ جانفزاء اور موت کا جھونکا ان کے حق میں بادِ بہاری بن کر آتا ہے۔ قوم عاد پر جو ہوا چلائی گئی تھی وہ حضرت ہودؑ اور ان کے ساتھیوں کے لیے نسیم بن گئی تھی۔

ہودؑ گرد مومناں خطے کشید نرم می شد باد کانجا ی رسید
ہمچنیں بادِ اجل با عارفان نرم و خوش ہمچو نسیمِ بوستان[۱۲۸]

جبر واختیار

جبر و اختیار کی بحث علمِ کلام کی مشکل ترین بحثوں میں سے ہے۔ ایک فرقہ اختیار کا منکر اور جبر محض کا قائل ہے اور عقائد و فرق کی تاریخ میں جبریہ کے لقب سے مشہور ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اگر انسان مجبور محض ہوتا تو وہ خدا کی طرف سے امر و نہی کا مخاطب کیوں بنتا اور شریعت کے احکام اس کی طرف کیوں متوجہ ہوتے۔ کیا کسی نے کسی پتھر کو بھی حکم دیتے سنا ہے۔

---

۱۲۶ مثنوی ص ۲۷۶

۱۲۷ مثنوی ص ۲۷۶

۱۲۸ مثنوی ص ۲۷۶

جبریش گوید کہ امر و نہی راست | اختیارے نیست دین جملہ خطا است
جملہ قرآن امر و نہی است و وعید | امر کردن سنگ مرمر راکہ دید[129]

فرماتے ہیں کہ اختیار کا عقیدہ انسان کی فطرت میں داخل ہے اور وہ روزمرہ کی زندگی میں اس عقیدہ کا اقرار اور جبر کا انکار کرتا رہتا ہے۔ کسی پر چھت کی لکڑی گر جاتی ہے تو اس کو چھت پر غصہ نہیں آتا۔ سیلاب سامان بہا لے جاتا ہے تو کسی کو اس پر غصہ اتارتے نہیں دیکھا۔ ہوا کسی کی پگڑی اڑا لے جاتی ہے تو کوئی ہوا سے نہیں لڑتا۔ سب جانتے ہیں کہ یہ مجبور و بے قصور ہیں البتہ انسان کے ساتھ انسان کا یہ معاملہ نہیں۔ گویا صرف وہی صاحبِ اختیار ہے۔

گرز سقفِ خانہ چوبے بشکند | برتو افتد سخت مجروحت کند
ہیچ خشمے آیدت برچوبِ سقف | ہیچ اندر کیں اوباشی تو وقف
کہ چرا بر من زدود ستم شکست | باچرا بر من فتادو کرد پست
واں کہ قصد عورت تو می کند | صد ہزاراں خشم از تو سرزند
در بیاید سیل رخت تو برد | ہیچ باسیل آورد گیتی خرد
گر بیاید با دستارت ربود | کے ترا باباد، دل خشمے نمود
خشم در تو شد بیانِ اختیار | تانہ گوئی جبریانہ اعتذار[130]

وہ ایک قدم آگے بڑھا کر فرماتے ہیں کہ جانور تک جبر و قدر کے مسئلہ سے فطری طور پر واقف ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آلات و جامدات کا کچھ قصور نہیں۔ کتے کو بھی اگر پتھر مارا جائے تو وہ پتھر پر نہیں لپکتا بلکہ انسان کے پیچھے دوڑتا ہے، شتربان اونٹ کو مارتا ہے تو اونٹ کو لکڑی پر غصہ نہیں آتا، شتربان سے انتقام لینا چاہتا ہے۔ جب حیوان تک اس حقیقت سے واقف ہیں تو انسان کو جبری بننے سے شرم آنی چاہئے۔

---

[129] مثنوی ص ۲۵

[130] مثنوی ص ۴۶۳

ہمچنیں گر بر سگے سنگے زنی | بر تو آرد رود گردد منثنی
گر شتربان اشترے رامی زند | آں شتر قصدِ زنندہ می کند
خشم اشتر نیست باآں چوبِ او | پس ز مختاری، شتر بردہ است بو
عقل حیوانی چو دانست اختیار | ایں مگو اے عقل انسان شرم دار
روشن است ایں لیک از طمع سحور | آں خورندہ چشم بر بندد ز نور
چونکہ کلی میل آں نان خورد نیست | روبہ تاریکی کند کہ روز نیست[۳۱]

علت و معلول

اسباب و علل کے بارے میں اسلامی فرقوں میں بڑی افراط و تفریط تھی، حکماء کے نزدیک کائنات میں علت و معلول کا سلسلہ قائم ہے اور ملول کبھی علت، مسبب کبھی سبب سے مختلف نہیں ہو سکتا، معتزلہ بھی اس رائے سے بڑی حد تک متاثر ہیں۔ ان کا بھی رجحان یہی ہے کہ جو چیز جس کی علت مان لی گئی، جس شئے کا جو خاصہ اور اثر تسلیم کر لیا گیا اس میں تغیر و انقلاب کا بہت کم امکان ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ بڑی مشکل سے خرق عادت کا وجود تسلیم کرتے ہیں اور کسی شئ کے اپنے خاصہ کے خلاف وقوع پذیر ہونے اور کسی حادثہ کے بغیر سبب کے وجود میں آنے کو بہت بعید سمجھتے ہیں۔ اشاعرہ دوسرے سرے پر ہیں۔ ان کے نزدیک کوئی چیز کسی چیز کی علت نہیں۔ نہ کسی شئ میں کوئی خاصہ اور تاثیر ہے۔ اس بے اعتدالی اور انتہا پسندی سے بھی نقصان پہنچا اور ہر شخص کو ہر بات کہنے اور اسباب کے انکار و ترک کا بہانہ مل گیا اور اس سے ایک بے نظمی اور تعطل پیدا ہوا۔

مولانا کا مسلک ان دونوں سروں کے درمیان ہے وہ اعتراف کرتے ہیں کہ اسباب کی ایک حقیقت ہے اور علل و معلولات اسباب و مسببات کا ایک سلسلہ ہے جس کا

---

[۳۱] مثنوی ص ۴۳۶

انکار نہ ممکن ہے۔ نہ معقول، عام سنۃ اللہ یہی ہے کہ مسببات اسباب کے تابع ہوں اور اشیاء سے ان کے خواص بر آمد ہوں، البتہ خرقِ عادت ممکن ہے اور کبھی کبھی اس کا وقوع ہوتا ہے فرماتے ہیں:

بیشتر احوال بر سنت رود   گاہ قدرت خارقِ سنت شود
سنت و عادت نہادہ بامزہ   باز کردہ خرقِ عادت معجزہ
بے سبب گر عزّ بما موصول نیست   قدرت از عزل سبب معزول نیست[132]

عام لوگ انہی اسباب کو دیکھتے ہی نادر معذور ہیں کہ ان کو کچھ اور نظر نہیں آتا:

حاصل آنکہ در سبب پیچیدہ   لیک معذوری ہمیں رادیدہ[133]

فرماتے ہیں کہ بیشک قطع اسباب مناسب نہیں، اسباب کی ایک حقیقت ہے لیکن مسبب الاسباب اس سے بھی بالاتر حقیقت ہے۔ وہ مسبب الاسباب، رب الاسباب اور قادرِ مطلق ہے۔ اس طرح اسباب پرستی نہ کرنے لگو کہ قادرِ مطلق کو بالکل معزول و معطل سمجھنے لگو۔

اے گرفتارِ سبب بروں مپر   لیک عزل آں مسبب ظن مبر
ہر چہ خواہد آں مسبب آورد   قدرتِ مطلق سببہا بر درد[134]

یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ اسباب صرف وہی نہیں ہیں جو ہمارے علم اور مشاہدہ میں ہیں بلکہ ان اسباب ظاہری سے اوپر کچھ اسباب اور ہیں جو ہماری نظر سے اوجھل ہیں۔ یہ اسبابِ باطنی ان اسباب ظاہری کے لیے اس طرح سے سبب اور محرک ہیں جس طرح یہ اسباب ظاہری مسببات و نتائج کے لیے۔ سببِ حقیقی اسباب ظاہری کو کبھی متحرک و عامل کر دیتا ہے اور کبھی بیکار و معطل کر کے رکھ دیتا ہے۔ سب سے اعلیٰ اور اصل سبب ارادۂ الٰہی اور امر الٰہی ہے:

---

۱۳۲ مثنوی ص ۲۶۱

۱۳۳ مثنوی ص ۲۶۱

۱۳۴ مثنوی ص ۴۲۷

سنگ بر آہن زنی آتش جہد | ہم بامر حق قدم بیروں نہد
سنگ و آہن خود سبب آمد و لیک | تو بالا تر نگر اے مردِ نیک
کایں سبب را آں سبب آورد پیش | بے سبب کے شد سبب ہر گز بخویش
ایں سبب را آں سبب عامل کند | باز گاہے بے پرد عاطل کند[۱۳۵]

ہم جس طرح ان اسبابِ ظاہری کو جانتے پہچانتے ہیں، انبیائے کرام ان اسبابِ حقیقی کو دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں۔

واں سبب ہا کا بنیاء را رہبر است | آں سببہازیں سببہا برتر است
ایں سبب را محرم آمد عقل ما | واں سببہا راست محرم انبیاء[۱۳۶]

وہ اسبابِ حقیقی اسبابِ ظاہری کے حاکم اور ان پر غالب ہیں:

ہست بر اسبابِ اسباب دگر | در سبب منگرد راں افگن نظر[۱۳۷]

یہ اسبابِ ظاہری اسبابِ حقیقی کے سامنے بہت حقیر و ضعیف ہیں، معاملہ حقیقی اسباب ہی سے وابستہ ہے۔

ایں سبب ہمچو مریض است و علیل | ایں سبب ہمچو چراغ است و فتیل
شب چراغت را فتیلے تو بتاب | پاک داں زینہا چراغِ آفتاب[۱۳۸]

انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں چونکہ ساری دنیا اسبابِ ظاہری میں اُلجھی ہوتی ہے اور اسباب پرستی اپنے پورے عروج پر ہوتی ہے خالق اسباب اور اس کی قدرت مطلقہ بالکل نگاہوں سے اوجھل اور دماغوں سے محو ہو چکی ہوتی ہے اور عالم کا عالم شرک اور ظواہر و مظاہر

---

۱۳۵ مثنوی ص ۲۵
۱۳۶ مثنوی ص ۲۵
۱۳۷ مثنوی ص ۲۴۶
۱۳۸ مثنوی ص ۱۴۱

پرستی میں گرفتار ہوتا ہے اس لیے انبیاء علیہم السلام اسباب پر ضرب لگاتے ہیں اور اسباب کے بجائے مسبب اور قادرِ مطلق کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بھی ان کے ہاتھوں سے سلسلۂ اسباب کے بالکل خلاف واقعات ظاہر کر کے اور معجزات دکھا کر اسباب کی بے حقیقی اور کمزوری ظاہر کرتا ہے۔

انبیاءؑ در قطع اسباب آمدند — معجزاتِ خویش برکیوان زوند
بے سبب بر بحر رابشگافتند — بے ذراعت چاش گندم یا فتند
ریگہا ہم آرد شد از سعیٔ شان — پشم بر ابریشم آمد کشکشان
جملہ قرآن است در قطعِ سبب — عز درویش و ہلاک بولہب[139]

لیکن اللہ تعالیٰ کی عمومی عادت اور سنتِ جاریہ اسباب سے مسببات کا وجود ہے اور اس سے بندوں کو سعی و تعلیم مقصود ہے۔

لیک اغلب بر سبب راند نفاذ — تا بداند طالبے جستن مراد[140]

اسی انداز پر مولانا ان تمام کلامی مسائل اور مذہب کے اصول و عقائد کی تشریح اور تلقین کرتے چلے جاتے ہیں جن کو متکلمین و اشاعرہ کے مناظرانہ طرزِ استدلال اور فلاسفہ کی طلسم آرائی نے چیستان اور نہایت خشک اور محدود موضوعِ بحث بنا دیا تھا۔ مولانا نے ان مباحث و حقائق کو علم کلام اور فلسفہ کے تنگ کوچہ سے نکال کر عام فہم اور عقل سلیم کے وسیع آفاق میں لے جا کر بحث کی اور دل نشین مثالوں عام فہم نکتوں اور سادہ موثر طرز بیان سے ان کو روزمرہ کی حقیقت اور زندگی کا واقعہ بنا دیا۔

---

[139] مثنوی ۲۴۶

[140] مثنوی ص ۴۲۷

مثنوی کا اثر

مثنوی نے عالم اسلام کے افکار و ادبیات پر بڑا گہرا اور دیرپا اثر ڈالا۔ اسلامی ادب میں ایسی شاذ و نادر کتابیں ملیں گی جنہوں نے عالم اسلام کے اتنے وسیع حلقہ کو اتنی طویل مدت تک متاثر رکھا ہے۔ چھ صدیوں سے مسلسل دنیائے اسلام کے عقلی، علمی، ادبی حلقے اس کے نغموں سے گونج رہے ہیں اور وہ دماغ کو نئی روشنی اور دلوں کو نئی حرارت بخش رہی ہے۔ اس سے ہر دور میں شاعروں کو نئے مضامین، نئی زبان، نیا اسلوب ملتا رہا اور وہ ان کے قوائے فکر اور ادبی صلاحیتوں کو ابھارتی رہی۔ معلمین و متکلمین کو اپنے زمانہ کے سوالات و شبہات کو حل کرنے کے لیے اس سے نئے نئے دلائل، دل نشین مثالیں، دلآویز حکایتیں اور جواب کی نئی نئی راہیں ملتی رہیں اور وہ اس کے سہارے اپنے زمانہ کی بے چین طبیعتوں اور ذہین نوجوانوں کو مطمئن کرتے رہے۔ اہل سلوک و معرفت کو اس سے عارفانہ مضامین دقیق و عمیق علوم اور سب سے بڑھ کر محبت کا پیغام اور سوز و گداز اور جذب و مستی کا سامان ملتا رہا اور وہ ان کی خلوتوں اور انجمنوں کو صدیوں تڑپاتی اور گرماتی رہی اس لیے ہر دور کے اہلِ محبت اور اہل معرفت نے اس کو شمعِ محفل اور ترجمانِ دل بنا کر رکھا۔

اس کے مضامین یکسر تنقید سے بالاتر اور ہر قسم کی لغزش اور خطا سے مبرّا نہیں۔ بہت سے فاسد العقیدہ صوفیوں اور اہل ہویٰ نے اس سے کبھی کبھی غلط فائدہ بھی اٹھایا ہے۔ وحدتِ وجود کے قائلین کو اب بھی اس سے اپنے مسلک کے لیے دلائل و شواہد مل جاتے ہیں۔ وہ بہر حال ایک انسان کا کلام ہے جو معصوم نہ تھا اور جس کے مضامین میں اس کے قلبی واردات اور خارجی "تاثرات" کو بھی دخل ہے۔ اس سبب کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اپنے وقت کا ایک بڑا علمی کارنامہ اور اسلام کی عقلی برتری اور اس کی غیر فانی زندگی کا ثبوت ہے۔ اس نے عالم اسلام کے فکری تعطل، علمی و ادبی جمود اور تقلیدی ادب و علم کلام پر کاری ضرب لگائی اور اسلام کے کاروانِ فکر کو جو ساتویں صدی میں آمادۂ قیام اور مائل بہ آرام تھا، دوبارہ متحرک و سرگرمِ سفر کر دیا۔

اس کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ بیسویں صدی عیسوی میں جب عالم اسلام پر دوبارہ مادیت و حسیت کا حملہ ہوا اور یورپ کے نئے فلسفہ اور سائنس نے قلوب میں شکوک و شبہات کی تخم ریزی کی اور ایمانیات و غیبیات کی طرف سے ایک عام بے اعتمادی پیدا ہونے لگی، اس کا رجحان بڑھنے لگا کہ ہر وہ چیز جو مشاہدہ و تجربہ کے ماتحت نہ آسکے اور حواس ظاہری اس کی گرفت نہ کرسکیں، وہ موجود نہیں عقائد کی قدیم کتابوں اور قدیم طرز استدلال و علم کلام نے اس کا مقابلہ کرنے سے معذوری ظاہر کی تو مثنوی نے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کا (جو یورپ کی مادی اور سیاسی فتوحات سے کم خطرناک نہ تھا) کامیاب مقابلہ کیا اور دلوں میں دوبارہ دینی و غیبی حقائق کی وقعت، علوم انبیاء کی عظمت، عالم غیب کی وسعت اور قلب و روح، ایمان و وجدان کی اہمیت کا نقش قائم کر دیا اور فلسفہ و مادیت کے صدہا زخم خوردہ نوجوانوں اور فاضلوں کو جو الحاد و ارتداد کے دروازہ پر کھڑے تھے یا ایمان و اسلام کی سرحد عبور کر چکے تھے دوبارہ ایمان و یقین کی دولت عطا کی۔ ہندوستان میں ان اہل علم کی ایک بڑی تعداد ہے جو اس حقیقت کا صاف اعتراف کرتے ہیں کہ ان کو مثنوی کی بدولت دوبارہ دولتِ اسلام نصیب ہوئی اور وہ اس کے فیض سے مسلمان اور صاحبِ ایمان ہیں۔ بیسویں صدی کے سب سے بڑے مسلمان فلسفی اور مفکر (ڈاکٹر محمد اقبالؒ) نے شیخ رومی کے فیض وارشاد اور اپنے تلمذ واسترشاد کا جابجا اعتراف کیا ہے اور اس کا برملا اظہار کیا ہے کہ مثنوی نے ان کو ایک نئی روح اور ایک نیا جذبہ عطا کیا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

پیر رومی مرشدِ روشن ضمیر	کاروانِ عشق و مستی را امیر
منزلش برتر ز ماہ و آفتاب	خیمہ را از کہکشان ساز و طناب
نور قرآن درمیانِ سینہ اش	جام جم شرمندہ از آئینہ اش

از نئے آں نے نواز پاک زاد — باز شورے در نہاد من فتاد[141]

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

رومی آں عشق و محبت راد لیل — تشنہ کا مان را کلامش سلسبیل[142]

لیکن اس کے ساتھ وہ شکایت اور احتجاج کرتے ہیں کہ ایک طبقہ نے اپنی نظر اس کے الفاظ اور ظاہری مطالب میں محدود رکھی اور اس کی جاں گدازی اور دل سوزی کے بجائے رقص و وجد کا ذریعہ بنایا:

شرحِ او کردند او راکس ندید — معنیٔ اوچوں غزال از ما رمید
رقصِ تن از حرفِ او آموختند — چشم را از رقصِ جان بردو ختند[143]

لیکن یہ نقص ہمارا ہے۔ مثنوی کا نہیں۔ مثنوی اس دورِ انقلاب میں بھی رفیقِ راہ بن سکتی ہے اس مادہ پرست دور کی سب سے زیادہ نایاب جنس سوز و گداز اور محبتِ پاک باز ہے:

دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے — پھر اس میں عجب کیا کہ تو بیباک نہیں ہے
وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن — پرکار و سخن ساز نمناک نہیں ہے[144]

یہ دولتِ بیدار مثنوی سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ عصرِ حاضر کے نوجوانوں کو وصیت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

---

141 مثنوی" پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق" ص ۱
142 جاوید نامہ ص ۲۴
143 جاوید نامہ ص ۲۲۴
144 بال جبریل

پیر رومی را رفیق راہ ساز   تا خدا بخشد ترا سوز وگداز
زانکہ رومی مغز را داند ز پوست   پائے او محکم فتد در کوئے دوست[۱۲۵]

---

[۱۲۵] جاوید نامہ ص ۲۲۴

ہماری چند دیگر مطبوعات



دعوۃ اکیڈمی
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی
پوسٹ بکس: 1485 اسلام آباد، پاکستان، فون: 2262031، 051-9261751، فیکس: 051-2261648
ای میل: publications.da.iiui@gmail.com، ویب سائٹ: www.dawahacademy.org